قرآنی نظامِ ربوبیت کا پیامبر

اشاعت کا پچھترواں سال

ماہنامہ

طلوعِ اسلام

لاہور

جنوری 2018ء

علامہ اقبالؒ کے ایماء اور قائداعظمؒ کی خواہش پر 1938ء سے شائع ہونے والا ماہنامہ

وَمَآ اَرْسَلْنٰكَ اِلَّا رَحْمَةً لِّلْعٰلَمِيْنَ ﴿۱۰۷﴾ (21:107)



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کی روشنی میں اللہ اور انسان کا تعلق

1- اللہ کی ذات کے متعلق ہم ازخود کچھ نہیں جان سکتے انسان زمان و مکان میں مقید محدود علم کی صلاحیت رکھتا ہے اور وہ لامحدود کے علم رکھنے کی قدرت نہیں رکھتا۔ خدا نے اپنی جن صفات کو قرآن میں بیان کیا ہے' ان سے ہم اس کے متعلق اتنا ہی اندازہ کر سکتے ہیں۔

2- خدا تمام کائنات کا خالق اور اس پر مطلق اختیار رکھتا ہے۔ خدا کی صفاتِ مطلق کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ اللہ ہر چیز پر قادر ہے اور وہ ہر چیز کے پیمانے ان مطلق صفات کے تحت بناتا ہے۔ قرآن نے صفاتِ خداوندی کا ذکر' الاسماء الحسنیٰ کہہ کر مزید وضاحت کی ہے۔ حسن صحیح صحیح تناسب (Proportion) کا نام ہے۔ اگر کسی شے کا ذرا سا تناسب بھی بگڑ جائے تو اس کا حسن باقی نہیں رہتا۔ الاسماء الحسنیٰ خدا کی ذات کے مختلف پہلو (Facets) ہیں خدا کی ذات موجود فی الخارج ہے اور چونکہ مکمل ترین اور بلند ترین ذات ہے اس لئے اس کے خصائص و صفات بھی مکمل ترین اور بلند ترین ہیں۔

3- قرآن کے بعد وحی کا سلسلہ منقطع ہونے کی وجہ سے صفات و اقدارِ خداوندی کے علم کا حصول اسی قرآنِ کریم کے ذریعے ہی ممکن ہے' جسے قیامت تک کے لئے نوع انسانی کی ہدایت کے لئے محفوظ کر دیا گیا ہے اور اس کے علاوہ اللہ کی ہدایت جاننے کے لئے کوئی صورت نہیں۔ لہٰذا اس کی اطاعت کا بھی یہی مفہوم ہے کہ قرآن کریم میں دیئے گئے اقدار و احکام کی اطاعت کی جائے اس کو پکارنے کے معنی بھی یہی ہیں کہ زندگی کے ہر دوراہے پر' اس کی دی ہوئی راہنمائی سے دریافت کیا جائے کہ ہم کس راستہ کو اختیار کریں۔

4- خدا کی ذات میں اس کی صفات مکمل ترین شکل میں جلوہ بار ہوتی ہیں۔ بجز ان صفات کے جن کا تعلق خالصتاً خدا کی لامتناہیت اور لامحدودیت سے ہے' انسانی ذات کی بنیادی صفات خدا کی طرف سے ودیعت کی گئی ہیں' اس فرق کے ساتھ کہ:

(الف) انسانی ذات کی یہ صفات محدود' سمٹی ہوئی شکل میں ہوتی ہیں۔

بقیہ صفحہ نمبر 68 پر

ماہنامہ
طلوعِ اسلام
لاہور

جنوری 2018ء

جلد 71 | شمارہ نمبر 01

اس شمارے میں

عنوان	مصنف	صفحہ نمبر
لمعات: ختمِ نبوّت	پرویز	4
چھ خطبات	پرویز	8
پاکستان میں قرآنی نظام کس طرح قائم ہو؟	خورشید انور، سوات	18
عقل، قرآن اور انسانی مسئلہ	اعجاز رسول، گلاسگو	22
بچوں کا صفحہ: تم بہت بہادر ہو	ادارہ	26
نوجوانوں کا صفحہ: نخلِ سینا	محمد علی صابر صدیقی	28
انسان کی تخلیق کا مقصد	خواجہ ازہر عباس، کراچی	32
تخلیق وارتقاء	مرزا شاہد برلاس، کراچی	41
دوقومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان	ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد	47

ENGLISH SECTION

A Speech Delivered By Afia Farooqi
At the Annual Convention 2017 — 56

***Manzil ba Manzil* (منزل بہ منزل)**
Chapter 6: Tears of passion (*Shola-e-Namnaak* شعلہ نمناک)
– To my fellow travelers (Tulu-e-Islam Convention, April, 1962)
(Translated by: M. Alam) — 59

ناشر و چیئرمین: محمد اکرم راٹھور

مجلسِ ادارت
ڈاکٹر انعام الحق، ڈاکٹر منظور الحق
خواجہ ازہر عباس

مدیر انتظامی: محمد سلیم اختر

قانونی مشیر: ملک محمد سلیم ایڈووکیٹ

ادارہ کا مضمون نگار کی تحریر سے کُلّی اتفاق ضروری نہیں۔

زرِ تعاون: 50 روپے فی پرچہ
پاکستان: 550 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 800 روپے سالانہ
بیرونِ ملک: 2500 روپے سالانہ
رجسٹرڈ ڈاک: 5000 روپے سالانہ

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان)
Phone: 042-35714546 , Cell: 0321-4460787
idarati@gmail.com
www.facebook.com/Talueislam

Bank Account Idara Tolu-e-Islam
National Bank of Pakistan, Main Market Branch Gulbarg Lahore
For Domestic Transactions
Bank A/C No: 0465004073177672
For International Transactions
IBAN:PK36NBPA0465004073177672
Swift Code: NBPAPKKAA02L

ادارہ طلوعِ اسلام (رجسٹرڈ) کی مطبوعات سے حاصل شدہ جملہ آمدن قرآنی فکر عام کرنے پر صَرف کی جاتی ہے

اشتیاق اے مشتاق پرنٹرز سے چھپوا کر B-25، گلبرگ II لاہور سے شائع کیا

طلوعِ اسلام

عقابی شان سے جھپٹے تھے جو، بے بال و پر نکلے
ستارے شام کے خونِ شفق میں ڈوب کر نکلے

ہوئے مدفونِ دریا زیر دریا تیرنے والے
طمانچے موج کے کھاتے تھے جو، بن کر گہر نکلے

غبارِ رہ گزر ہیں، کیمیا پر ناز تھا جن کو
جبینیں خاک پر رکھتے تھے جو، اکسیر گر نکلے

ہمارا نرم رو قاصد پیامِ زندگی لایا
خبر دیتی تھیں جن کو بجلیاں وہ بے خبر نکلے

حرم رسوا ہوا پیر حرم کی کم نگاہی سے
جوانانِ تتاری کس قدر صاحب نظر نکلے

زمیں سے نوریانِ آسماں پرواز کہتے تھے
یہ خاکی زندہ تر، پائندہ تر، تابندہ تر نکلے

جہاں میں اہل ایماں صورتِ خورشید جیتے ہیں
اُدھر ڈوبے اِدھر نکلے، اِدھر ڈوبے اُدھر نکلے

یقیں افراد کا سرمایۂ تعمیر ملت ہے
یہی قوت ہے جو صورت گر تقدیر ملت ہے

(بانگِ درا۔ علامہ اقبالؒ)

(جاری ہے)

پرویز

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لمعات

ختمِ نبوّت

مسئلہ ختمِ نبوّت نے آج کل پھر غیر معمولی اہمیت اختیار کر رکھی ہے۔ چاروں طرف اس کا شور ہے۔ لیکن میں نے محسوس کیا ہے کہ (1953ء کے ہنگاموں کی طرح اب بھی) اس کا صحیح اور متعین مفہوم بہت کم لوگوں کے ذہن میں ہے۔ یہ مقدس موضوع، جو دین کی اصل اساس ہے، اوائلِ عمر ہی سے میرا مرکزِ فکر اور محورِ نظر رہا ہے اور میں گذشتہ چالیس سال سے اس پر لکھتا اور بولتا چلا آ رہا ہوں۔ میں نے ضروری سمجھا ہے کہ اس مسئلہ کی اہمیت اور صحیح مفہوم نہایت مختصر الفاظ میں قوم کے سامنے پیش کر دیا جائے۔ اس سلسلے میں ایک واقعہ کا تمہیداً ذکر کرنا ضروری ہے۔

(2) 1926ء کی بات ہے کہ ریاست بہاولپور کی ایک خاتون نے عدالت میں یہ دعویٰ دائر کیا کہ اُس کا خاوند مرزائی ہو کر مرتد ہو گیا ہے۔ اس لئے اُس کے ساتھ اُس کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کر لی اور مسلمانوں کی طرف سے اُس دور کے چوٹی کے علماء حضرات شہادت کے لئے پیش ہوتے رہے۔ زیر بحث مسئلہ ختمِ نبوت تھا۔ نو سال تک یہ مقدمہ زیر سماعت رہا۔ اُس کے بعد منشی محمد اکبر (مرحوم) ڈسٹرکٹ جج بہاولنگر نے 7 فروری 1935ء کو اس کا فیصلہ سُنا دیا۔ یہ فیصلہ اُس زمانے میں بھی الگ شائع ہوا تھا اور اُس کے بعد بھی شائع ہوتا رہا۔ حال ہی میں اسے ''محفلِ ارشاد یہ، سیالکوٹ'' نے پھر کتابی شکل میں شائع کیا ہے اور یہی نسخہ اس وقت میرے پیش نظر ہے۔ محترم ڈسٹرکٹ جج نے اپنے فیصلے میں پہلے یہ لکھا ہے کہ وہ چاہتے تھے کہ ''مقام نبوّت'' کا کوئی جامع تصوّر اُن کے سامنے آ سکے۔ اس سلسلے میں علماء حضرات کی طرف سے نبی کی مختلف تعریفیں پیش ہوتی رہیں لیکن اُن سے اُن کا اطمینان نہ ہوا۔

> ''آخر کار ایک سال رسالہ میں ایک مضمون بعنوان ''میکانکی اسلام'' از جناب چوہدری غلام احمد صاحب پرویز میری نظر سے گزرا۔ اس میں اُنہوں نے مذہبِ اسلام کے متعلق آج کل کے روشن ضمیر طبقہ کے خیالات کی ترجمانی کی ہے اور پھر خود ہی اُس کے حقائق بیان کئے ہیں۔ اس سلسلے میں نبوّت کی جو حقیقت اُنہوں نے بیان کی ہے۔ میری رائے میں اس سے بہتر اور کوئی بیان نہیں کی جا سکتی۔ اور میرے خیال میں فریقین میں سے کسی کو اس پر انکار بھی نہیں ہو سکتا۔ اس لئے میں اُن کے الفاظ میں ہی اس حقیقت کو بیان کرتا ہوں۔''
>
> (صفحہ نمبر 107)

اس کے بعد فاضل جج نے میرے مضمون کو بڑی تفصیل کے ساتھ نقل کیا اور اُس کی بنیاد پر یہ فیصلہ دیا کہ:

''مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے۔ لہٰذا اُس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے۔'' (صفحہ نمبر:182)

میں نے اس واقعہ کا ذکر یہ بتانے کے لئے کیا ہے کہ جب تک مقامِ نبوّت یا نبی کی صحیح تعریف سامنے نہ ہو مسئلہ ختمِ نبوت سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ اسی کو میں ذیل میں مختصر الفاظ میں بیان کرنا چاہتا ہوں۔

(3) انسانی علم کا ذریعہ مطالعہ، مشاہدہ، تجربہ، تعلیم و تعلّم و درس و تدریس ہے۔ یہ ذرائعِ علم ہر شخص کے لئے کھلے ہیں اور جس کا جی چاہے اپنی محنت اور استعداد کے مطابق مطلوبہ علم حاصل کر سکتا ہے۔

لیکن علم کا ایک اور ذریعہ تھا جو ان ذرائع سے بالکل منفرد اور یکسر الگ تھا۔ اس علم کو خدا سائے تعالیٰ کسی منتخب ہستی کو براہِ راست عطا کرتا تھا۔ اس میں نہ اُس ہستی کی اپنی فکر کو کوئی دخل ہوتا تھا اور نہ ہی وہ اُسے اپنی محنت اور کاوش سے حاصل کر سکتا تھا۔ اس علم کی وحی کہا جاتا ہے اور جس ہستی کو یہ علم عطا ہوتا تھا، قرآن نے اُسے نبی اور رسول کہہ کر پکارا ہے۔ نبی اور رسول ایک ہی شخصیت کے دو نام ہیں۔ یوں سمجھئے کہ خدا کی طرف سے اس علم کو پانے کی جہت سے وہ نبی کہلاتا ہے اور اسے دوسرے انسانوں تک پہنچانے کی جہت سے رسول۔ بہرحال ہر نبی رسول ہوتا تھا اور ہر رسول نبی۔

(4) نبی کو جو علم خدا کی طرف سے ملتا تھا، اُسے وحی کہہ کر پکارا گیا ہے۔ یہی وحی اُس نبی کی کتاب کہلاتی تھی واضح رہے کہ اس کتاب کے لئے یہ ضروری نہیں تھا کہ وہ ایک ضخیم جلد ہو۔ وحی کا ایک حکم بھی اُس نبی کی کتاب کہلاتا تھا___ کتاب کے معنی حکم یا قانون کے ہیں۔ لہٰذا کوئی نبی بلا کتاب نہیں آتا تھا۔

(5) قرآن کی رو سے نبوت کا یہ سلسلہ حضرت نوح علیہ السلام سے شروع ہوا اور رفتہ رفتہ آگے بڑھتا گیا۔ ہوتا یہ کہ ایک نبی آتا، وہ خدا کی وحی یا کتاب اپنی اُمت کو دے جاتا۔ اُس کے بعد یا تو اُس کے نام لیوا اُس میں تحریف کر دیتے اور یا وہ دست بُردِ زمانہ سے ضائع ہو جاتی تو اُس کے بعد ایک اور نبی مبعوث ہو جاتا، علمِ خداوندی کی رُو سے سابقہ نبی کی وحی سے جو کچھ باقی رکھنا مقصود ہوتا، اُس نبی کو وہ وحی بھی عطا کر دی جاتی اور اُس کے علاوہ ضرورت کے مطابق مزید احکام بھی دے دیئے جاتے۔

(6) یہ سلسلہ اسی طرح جاری رہا۔ تآنکہ مشیتِ خداوندی نے یہ طے کیا کہ اب ایک ایسا ضابطۂ حیات بذریعہ وحی نازل کر دیا جائے جو تمام انسانوں کے لئے قیامت تک کے لئے زندگی کے ہر شعبہ میں رہنمائی کے لئے کافی اور وافی ہو۔ یہ ضابطۂ حیات قرآن کریم ہے جو حضور نبی اکرم ﷺ کو عطا ہوا___ اس ضابطہ کے متعلق خود خدائے تعالیٰ نے یہ فرمادیا کہ: وَتَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا ۭ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ ۚ (6:115) ''تیرے ربّ کی باتیں صدق اور عدل کے ساتھ تکمیل تک پہنچ گئیں۔ اب اُنہیں تبدیل کرنے والا کوئی نہیں۔'' اس کے ساتھ ہی یہ بھی فرمادیا کہ: اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ ۝ (15:9) ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے اور اس کی حفاظت بھی ہمارے ذمے ہے۔

تصریحاتِ بالا سے واضح ہے کہ:

(1) قرآن کریم قیامت تک تمام نوعِ انسان کے لئے ضابطۂ حیات ہے۔

(2) یہ ہر طرح سے مکمل بھی ہے اور غیر متبدل بھی اور (3) اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے رکھا ہے۔

ظاہر ہے کہ اس قسم کے ضابطۂ ہدایت کی موجودگی میں قیامت تک وحی خداوندی کی ضرورت نہیں پڑ سکتی۔ بالفاظِ دیگر اس ضابطۂ ہدایت کی تکمیل کے ساتھ سلسلۂ نبوت کا خاتمہ ہو گیا ــــ یہ خدا کی آخری کتاب ہے اور جس ذاتِ گرامی ﷺ پر یہ کتاب نازل ہوئی تھی وہ خدا کا آخری نبی ﷺ ــــ نہ اس وحی کے بعد کسی اور وحی کی ضرورت ہے اور نہ ہی اُس نبی ﷺ کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی گنجائش۔ قرآن خاتم الکتب ہے اور حضور نبی اکرم ﷺ خاتم النبیین۔ جو شخص حضور ﷺ کے بعد اس امر کا دعویٰ کرتا ہے کہ اُسے خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے وہ اپنے اس دعویٰ میں جھوٹا ہے۔ خدا پر افترا کرتا ہے اور حضور رسالت مآب ﷺ کی شانِ اقدس میں انتہائی گستاخی۔ کیونکہ وحی کے دعویٰ سے وہ (معاذ اللہ) حضور ﷺ کا ہمسر ہونے کا مدعی ہو جاتا ہے۔ یہ کہنا کہ کسی کو حضور ﷺ کی اطاعت سے نبوت مل سکتی ہے۔ مقامِ نبوت سے بے خبری کی دلیل ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے۔ نبوت صرف خدا کی طرف سے وہبی طور پر ملتی تھی اور حضور ﷺ کی ذاتِ گرامی پر اُس کا خاتمہ ہو گیا۔ یہ بھی واضح رہے کہ نبوت کی مختلف قسمیں نہیں ہوتی۔ ظلّی، بروزی، حلولی وغیرہ اصطلاحات مجوسیوں کی وضع کردہ ہیں۔ اسلام کے ساتھ ان کا کوئی تعلق نہیں۔

(7) ایک رسول خدا کی وحی کو انسانوں تک پہنچاتا ہی نہیں تھا، بلکہ وہ ایک اُمت کی تشکیل کرتا تھا جو اُس وحی کے مطابق ایک نیا نظام وجود میں لاتی تھی۔ یہ اُمت اُس نبی کی طرف نسبت سے متشکل ہوتی تھی۔ مثال کے طور پر یوں سمجھئے کہ ایک شخص جو حضرت عیسیٰ ؑ پر ایمان لاتا ہے۔ وہ اُمتِ عیسوی کا فرد قرار پاتا ہے۔ جب تک وہ حضرت عیسیٰ ؑ کو آخری نبی مانتا ہے۔ وہ اُس اُمت کا فرد رہتا ہے۔ لیکن جونہی وہ حضرت عیسیٰ ؑ کے بعد ایک اور نبی ــــ (یعنی نبی اکرم ﷺ) کی نبوت پر ایمان لے آتا ہے، وہ اُمتِ عیسوی سے کٹ کر اُمتِ محمدیہ ﷺ میں داخل ہو جاتا ہے۔ حالانکہ وہ اُس وقت حضرت عیسیٰ ؑ کو بھی خدا کا نبی مانتا ہے۔ اسی مثال سے یہ واضح ہے کہ اگر کوئی شخص رسول ﷺ کے بعد کسی شخص کو نبی تسلیم کر لیتا ہے تو وہ اُمتِ محمدیہ ﷺ سے کٹ کر اُس نئے نبی کی امت میں شامل ہو جاتا ہے۔ خواہ وہ رسول اللہ ﷺ کی نبوت پر بھی ایمان کیوں نہ رکھتا ہو۔ اس اعتبار سے خدا کے آخری نبی ﷺ کی طرف نسبت سے بننے والی امت، دین کے نقطۂ نگاہ سے آخری اُمت ہوتی ہے ــــ اسی اُمت کو مسلمان کہا جاتا ہے ــــ اس سے ظاہر ہے کہ اگر کوئی شخص رسول اللہ ﷺ کے بعد کسی کو نبی تسلیم کرتا ہے تو اُسے مسلمان نہیں تسلیم کیا جا سکتا۔ نہ ہی اسے مسلمان قرار دیا جا سکتا ہے جو اُس مدعی نبوت کو مسلمان کہے۔

(8) یہ ہے قرآن کریم کی روشنی میں ختمِ نبوت کا مفہوم، منطوق اور اس کا عملی نتیجہ۔ آپ دیکھیں گے کہ اس میں نہ کسی شک وشبہ کی گنجائش ہے نہ بحث وتمحیص کی ضرورت۔ بات بالکل واضح ہے۔

(9) میں نے اس جگہ اس اہم مسئلے پر نہایت مختصر الفاظ میں گفتگو کی ہے۔ اس کی اہمیت کے پیشِ نظر میں نے اس

موضوع پر ایک مستقل تصنیف مرتب کی ہے جو اس وقت کتابت وطباعت کے ابتدائی مراحل میں ہے، اُس میں ان نکات کی پوری پوری تفصیل آجائے گی۔ ویسے میں نے اس موضوع پر اپنی کتاب ــــ شاہکارِ رسالت، عمر فاروقؓ ــــ کے آخری باب میں بھی سیر حاصل بحث کی ہے۔

میں اس مقالہ کو اُن الفاظ پر ختم کرنا چاہتا ہوں جو میری مایۂ ناز تصنیف ''معراجِ انسانیت'' کے افتتاحیہ کا مقطع کا بند ہیں اور میرے لئے باعثِ صد فخر وسعادت۔

''خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا۔ آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لئے جو قوانین دیئے جانے تھے، وہ اپنی انتہائی شکل میں دے دیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزل مقصود تک پہنچنے کے لئے نہ کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت رہی اور نہ کسی اور ہادیٔ طریقت کی احتیاج۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لئے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اُس ذاتِ اقدس واعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اُٹھتا ہے کہ ؎

مقامِ خویش اگر خواہی در ایں دیر بحق دل بند و راہِ مصطفیٰ ؐ رو

(مفہوم: اگر اس دُنیا میں آپ بلند ترین مقام ومرتبہ چاہتے ہیں تو اللہ کی بندگی میں دل کو لگاؤ اور مصطفیٰ ﷺ کے اسوۂ حسنہ کو اپنا راہِ عمل بناؤ۔ س۔ا)

(مطبوعہ طلوع اسلام، جولائی 1974ء)

ضرورتِ رشتہ

ایک بیٹا جس کی عمر 26 سال، قد 6 فٹ، آئی ٹی انجینئر، جاب دبئی میں ہے، کے لئے قرآنی گھرانے سے موزوں رشتہ کی ضرورت ہے۔ لیڈی ڈاکٹر، انجینئر اور لیکچرار کو ترجیح دی جائے گی۔ خواہشمند احباب درجِ ذیل رابطہ نمبر پر بات کر سکتے ہیں۔

میاں ارشاد: 0321-6627559

ضرورتِ رشتہ

ایک بیٹی عمر 38 سال، اسسٹنٹ پروفیسر، گریڈ 18، شعبہ انگلش لٹریچر کے لئے، قرآنی کیریکٹر کے حامل موزوں رشتہ کی ضرورت ہے۔ خواہشمند حضرات درجِ ذیل نمبر پر رابطہ فرمائیں۔

0322-6386991

غلام احمد پرویزؒ

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شرابِ کہن

چھ خطبات

ایک حوالہ کی تلاش میں پُرانے کاغذات اُلٹ پلٹ رہا تھا کہ ان میں خطبات کا ایک مسودہ ملا۔ مجھے یاد نہیں پڑتا کہ یہ خطبات کب لکھے تھے اور ان کے مخاطب کون تھے۔ قرائن سے اندازہ ہوتا ہے کہ یہ کوئی بیس بائیس برس اُدھر کی بات ہے اور ان کا عام فہم اور سلیس اندازِ بیان اشارہ کناں ہے کہ انہیں یا تو متوسط درجہ کے طلباء کے لئے لکھا گیا تھا اور یا کم تعلیم یافتہ طبقہ کے لیے۔ جہاں تک مجھے یاد پڑتا ہے، ان کی اشاعت کہیں نہیں ہوئی۔ مُرورِ زمانہ کے باوجود، ان کی افادی حیثیت میں کچھ فرق نہیں آیا، اس لئے میں نے مناسب سمجھا ہے کہ انہیں پیشِ خدمت قارئین کر دیا جائے۔

پہلا خطبہ:

قال اللہ تعالیٰ: اَتَسۡتَبۡدِلُوۡنَ الَّذِیۡ هُوَ اَدۡنٰی بِالَّذِیۡ هُوَ خَیۡرٌ ؕ (2:61)

اللہ تعالیٰ نے فرمایا کہ کیا تم اُس چیز کو جو بہت گراں قیمت ہے اس چیز کے بدلے میں دے دینا چاہتے ہو جو انتہائی پست درجے کی ہے؟

برادرانِ عزیز! اگر آپ بازار میں کسی شخص کو دیکھیں کہ وہ سو روپے کی سونے کی انگوٹھی دس روپے میں بیچ رہا ہے تو آپ کے دل میں پہلا خیال یہ گزرے گا کہ یہ انگوٹھی اس کی اپنی نہیں۔ چوری کی ہے۔ اسی لئے یہ اُسے اتنے سستے داموں فروخت کر رہا ہے۔ پنجابی زبان میں ایسے موقع پر کہتے ہیں کہ ''چوراں دے کپڑے تے ڈانگاں دے گز۔'' جب چوری کا کپڑا بکتا ہے تو اسے عام گزوں سے نہیں ماپا جاتا۔ اس کی پیمائش اُن گزوں سے کی جاتی ہے جن کی لمبائی لٹھ بھر کی ہو۔

لیکن اگر آپ کو اس کا بھی یقین آ جائے کہ وہ انگوٹھی چوری کی نہیں۔ اُس شخص کی اپنی ہے۔ تو پھر آپ اس کے سوا کسی نتیجے پر نہیں پہنچیں گے کہ وہ شخص پاگل ہے۔ کوئی سمجھدار آدمی ___ کوئی صاحبِ عقل وہوش ___ سو روپے کی چیز دس روپے میں نہیں بیچتا۔ آپ جس سے بھی اس بات کا ذکر کریں گے وہ بلا تامل کہہ دے گا کہ وہ شخص فی الواقعہ پاگل تھا۔

لیکن جو لوگ اُس شخص کو پاگل کہتے ہیں انہوں نے کبھی اپنی حالت پر غور نہیں کیا اور سوچا نہیں کہ وہ خود صبح سے شام تک کتنی مرتبہ اس قسم کے پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں۔ وہ اپنی کتنی گراں بہا چیزوں کو کتنے سستے داموں فروخت کرتے ہیں۔ آپ شائد حیران ہوں گے کہ وہ کون سے لوگ ہیں جو اس قسم کے پاگل پن کی حرکتیں کرتے ہیں؟ وہ کون سی بستیاں ہیں جن میں یہ لوگ رہتے ہیں؟ اگر آپ سے کہہ دیا جائے کہ وہ ہم میں سے ہی ہیں۔ اور ہماری ہی بستیوں میں بستے ہیں، تو شاید آپ اسے صحیح تسلیم کرنے پر آمادہ نہ ہوں ___ لیکن یہ بات ہے بالکل صحیح۔ اس میں کسی شک

وشبہ کی گنجائش نہیں۔ سنئے کہ یہ کس طرح صحیح ہے!

ہمارے ہاں ایک عام محاورہ ہے ___ اور میرا خیال ہے کہ آپ میں سے شاید ہی کوئی ایسا ہو جس نے اس محاورہ کا کبھی نہ کبھی استعمال نہ کیا ہو۔ یا کم از کم اسے سُنا نہ ہو۔ وہ محاورہ یہ ہے کہ ؎

مال صدقۂ جان، جان صدقۂ آبرو

آپ سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب بالکل واضح ہے۔ مال و دولت اچھی چیز ہے۔ اس سے دنیا میں انسان کے بہت سے کام نکلتے ہیں۔ اس سے ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس سے انسان کھانے پینے کی چیزیں خریدتا ہے۔ بیمار ہو تو علاج کراتا ہے۔ ڈاکٹر کی فیس دیتا ہے۔ دوائیاں خرید کر لاتا ہے۔ کپڑے بنواتا ہے۔ بچوں کو تعلیم دلواتا ہے۔ یہ سب کچھ پیسے کے زور پر ہوتا ہے۔ ہمارے ایک پرانے شاعر نے کہا ہے کہ ؎

پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

اس لئے دنیا میں پیسے کی بڑی قدر ہے۔ جو شخص پیسہ سنبھال کر رکھتا ہے اسے ہر شخص عقلمند کہتا ہے۔ جو پیسہ برباد کرتا ہے اُسے بیوقوف کہا جاتا ہے۔ لیکن زندگی میں ایسے وقت بھی آجاتے ہیں کہ جو شخص اس وقت پیسہ خرچ نہیں کرتا، اُسے سنبھال کر رکھتا ہے۔ ساری دنیا اس پر لعنت بھیجتی ہے۔ مثلاً ایک شخص کا بچہ بیمار ہے۔ اس کی حالت نازک ہو رہی ہے۔ اس شخص کے پاس بہت سارو پیہ جمع ہے۔ لیکن وہ اپنے بچے کے علاج پر کچھ خرچ نہیں کرتا۔ کبھی وہ اسے محلے کے عطار کے پاس لے جاتا ہے کہ دو پیسے کے شربت میں کام بن جائے۔ کبھی وہ کسی عامل کے پاس چلا جاتا ہے کہ اس کی جھاڑ پھونک سے فائدہ ہو جائے۔ بچے کی حالت دن بدن خراب ہوتی جاتی ہے۔ ساری دنیا اُسے کہتی ہے لیکن وہ اس کے علاج پر پیسہ خرچ نہیں کرتا۔ بالآخر بچہ جان دے دیتا ہے۔ سوچئے کہ کون ہے جو ایسے دولتمند باپ پر لعنت نہیں بھیجے گا؟ ہر شخص اس سے کہے گا کہ میاں! ٹھیک ہے۔ پیسہ اچھی چیز ہے۔ اس کی قدر کرنی چاہئے۔ اسے سنبھال کر رکھنا چاہئے۔ لیکن بچے کی جان کے مقابلے میں تو پیسہ کوئی چیز نہیں۔ انہی باتوں کے لئے تو پیسے کو سنبھال کر رکھا جاتا ہے۔ مال صدقۂ جان ہوتا ہے۔ جو شخص جان بچانے کے لئے مال خرچ نہیں کرتا وہ بدبخت بخیل ہے۔ وہ انسان نہیں۔ درندہ ہے۔ جان کے مقابلے میں مال کی حیثیت کیا ہے؟

آپ نے غور کیا کہ یہ بات کیا ہوئی؟ بات بالکل صاف ہے۔ مال و دولت بیشک اپنی قیمت رکھتے ہیں لیکن جان کی قیمت، مال سے کہیں زیادہ ہے۔ جو شخص کم قیمت کی چیز یعنی مال و دولت کو سنبھال کر رکھتا ہے اور اس سے کہیں زیادہ قیمتی چیز ___ یعنی جان ___ کو ضائع کر دیتا ہے، اُسے کوئی اچھا نہیں سمجھتا۔ جو شخص بڑی قیمت کی چیز کو بچانے کے لیے کم قیمت کی چیز کو قربان کر دیتا ہے، اس کی سب تعریف کرتے ہیں۔ یہی شخص عقلمند کہلاتا ہے۔

جہاں تک انسان کی اپنی جان بچانے کا تعلق ہے، بہت کم ایسے لوگ ہوں گے جو جان بچانے کی خاطر سب کچھ نہ کر گزریں۔ انسان تو ایک طرف، حیوانوں تک بھی اپنی جان بچانے کے لئے انتہائی کوشش کر دیتے ہیں۔ چیونٹی کو دیکھئے۔ کتنی ننھی سی جان ہے۔ لیکن اس کے سامنے انگلی رکھئے اور دیکھئے کہ وہ اس خطرے سے بچنے کے لئے کیا کچھ نہیں کرتی۔ جان بچانے کا جذبہ، ہر جاندار کے اندر قدرت کی طرف سے رکھا گیا ہے۔ کوئی ذی ہوش اپنی جان ضائع کرنے پر آمادہ نہیں ہوتا۔ خودکشی وہی کرتا ہے جس کے ہوش و حواس ٹھکانے نہ رہیں۔ جس کی عقل پر جذبات غالب آکر اُسے اندھا کر دیں۔ حیوانات کبھی خودکشی نہیں کرتے۔ غرضیکہ جان ایسی

چیز ہے جسے بچانے کی خاطر انسان سب کچھ قربان کر دیتا ہے۔ اس سے ظاہر ہے کہ جان کی قیمت بہت زیادہ ہے ــــ جان ہے تو جہان ہے ہمارے ہاں عام محاورہ ہے۔

لیکن، جان کی اتنی بڑی قیمت کے باوجود، ایسے وقت بھی آجاتے ہیں، کہ جو شخص اس وقت جان بچاتا ہے اُسے ہر شخص نفرت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور جو شخص جان دے دیتا ہے، ہر شخص اس کی تعریف کرتا ہے۔ مثلاً اگر کوئی درندہ انسان، کسی شریف زادی کی عصمت پر ہاتھ ڈالنا چاہے اور وہ غیرت مند خاتون اپنی عصمت بچانے کی کوشش میں اپنی جان دے دے، تو اس خاتون کی جرأت اور قربانی کا ہر جگہ چرچا ہوتا ہے۔ ہر شخص تعظیم سے اس کا نام لیتا ہے۔ ہم اپنے بچوں کو بڑے فخر سے اس کی کہانی سناتے ہیں۔ اسی کا نام غیرت ہے۔ اگر کسی باپ کے ساتھ اس کی جوان بیٹی جا رہی ہو اور کوئی روسیاہ اس لڑکی کی طرف میلی نظر سے دیکھے تو غیرت مند باپ چیتے کی طرح جھپٹ کر اس کا گلا دبوچ لے گا اور اس کی قطعاً پروا نہیں کرے گا کہ ایسا کرنے میں اس کی جان جاتی ہے یا رہتی ہے۔ اگر بیٹی کی عصمت کی حفاظت میں وہ باپ اپنی جان دے دیتا ہے تو ساری دنیا اس کا نام تعظیم سے لیتی ہے۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ وہ اس اصول پر عمل کرتا ہے کہ ــــ ''جان صدقۂ آبرو'' ــــ آبرو کی حفاظت کے لئے جان دے دینا، شرفِ انسانیت کا تقاضا ہے۔

لیکن جہاں ہمیں ایسے باپ ملیں گے جو بیٹی کی طرف بُری نگاہ سے دیکھنے والے کا گلا دبوچ لیں گے وہاں ایسے بے غیرت انسان بھی ملیں گے جو چند روپوں کی خاطر اپنی بیٹیوں کو دوسروں کے ہاں لے جائیں گے۔ ایسے لوگوں کا شمار رذیل ترین انسانوں میں ہوتا ہے۔ انہیں بے غیرت اور دیوث کہا جاتا ہے۔ کوئی شریف آدمی انہیں اپنے پاس بٹھانے کا روادار نہیں ہوتا۔ ان کے پاس کتنی دولت کیوں نہ جمع ہو جائے اور غلط معاشرے میں وہ اس دولت کی بناء پر اپنے لئے کوئی اُونچی جگہ بھی کیوں نہ حاصل کر لیں۔ دنیا انہیں کبھی عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھے گی۔ یہ کیوں؟ اس لئے کہ انہوں نے آبرو جیسی بیش بہا متاع کو مال و دولت جیسی کم قیمت چیز کے بدلے میں بیچ دیا۔ جو شخص کم قیمت کی چیز کی خاطر بڑی قیمت کی چیز کو قربان کر دیتا ہے۔ وہ انسانیت کے مقام سے گر جاتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جو سپاہی میدانِ جنگ سے پیٹھ دکھا کر بھاگ جاتا ہے وہ دنیا میں کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہتا۔ اس نے حق اور صداقت کی خاطر جان دینے کے بجائے، جان بچانے کو ترجیح دی۔ اس نے بہت بڑی قیمتی متاع کی حفاظت کے مقابلہ میں اُس سے کم قیمت کی چیز کو محفوظ رکھا۔ وہ دنیا کی نظروں میں ذلیل اور خوار ہو گیا۔ اس نے ''جان صدقۂ آبرو'' کے اصول پر عمل نہ کیا۔

لیکن ایک چیز قابل غور ہے۔ جہاں تک جان بچانے کا تعلق ہے، اس میں دنیا کے کسی انسان کو کسی قسم کا اختلاف نہیں۔ کوئی شخص پاکستان کا رہنے والا ہو یا انگلستان کا۔ افریقہ کا حبشی ہو یا امریکہ کا سفید فام، جنگل میں رہنے والا وحشی انسان ہو یا شہر کا مہذب باشندہ۔ ہر شخص اس سے متفق ہوگا کہ جان کا بچانا ضروری ہے لیکن جہاں تک آبرو کا تعلق ہے اس میں مختلف انسانوں میں ہی نہیں بلکہ مختلف قوموں میں بھی فرق ہے۔ ہمارے ہاں اگر کسی کنواری لڑکی سے لغزش ہو جائے اور اسے حمل قرار پا جائے تو اسے اس قدر

معیوب سمجھا جاتا ہے کہ بسا اوقات وہ لڑکی شرم کے مارے اپنی جان ہلاک کر لیتی ہے۔ لیکن انگلستان میں اسے قطعاً بُرا نہیں سمجھا جاتا۔ حتیٰ کہ اگر اس بچے کا باپ اُس لڑکی سے شادی کر لے تو اُس بچے کو قانوناً جائز بیٹا تسلیم کر لیا جاتا ہے۔ آبرو کے متعلق یہ اختلاف بڑا غور طلب ہے۔ انگلستان والے کہتے ہیں کہ چونکہ یہ چیز ہماری سوسائٹی میں بُری نہیں سمجھی جاتی اس لئے یہ بُری نہیں ہے۔ تمہاری سوسائٹی اسے بُرا سمجھتی ہے اس لئے تم اسے بُرا کہتے ہو۔ سوال یہ ہے کہ کیا کسی چیز کے اچھے یا بُرے ہونے کا معیار یہی ہے کہ جس چیز کو سوسائٹی اچھا قرار دے دے وہ اچھی ہو جاتی ہے اور جسے وہ بُرا کہہ دے وہ بُری ہوتی ہے؟ یہ معیار تو کوئی معیار نہیں۔ معیار ایسا ہونا چاہئے جس کے مطابق اچھی بات ہمیشہ اچھی سمجھی جائے اور بُری بات بُری ہی رہے خواہ ساری دنیا اسے اچھا کیوں نہ سمجھنے لگ جائے۔

ہمارے لئے یہ معیار ہے اللہ کی کتاب ___ قرآن مجید ___ وہی یہ بتاتا ہے کہ کون سی چیز زیادہ قیمتی ہے اور کون سی کم قیمت کی۔ کون سی چیز ایسی ہے جسے اس سے زیادہ قیمتی چیز کی خاطر قربان کر دینا چاہئے اور کون سی ایسی جسے کسی حالت میں بھی قربان نہیں کیا جا سکتا۔ ایسی چیزیں جنہیں کسی دوسری چیز کی خاطر قربان نہیں کیا جا سکتا۔ مستقل اقدار کہلاتی ہیں۔ اقدار، قدر کی جمع ہے اور قدر کے معنی ہیں قیمت۔ لہٰذا، قرآن مجید ہمیں یہ بتاتا ہے کہ مستقل اقدار کیا ہیں۔ انہی کو نہ بدلنے والے اصول یا قوانینِ خداوندی کہا جاتا ہے۔

جو شخص قرآن مجید کی بتائی ہوئی اقدار کو صحیح مانتا ہے اُسے مسلمان کہتے ہیں اور جو مملکت ان اقدار کی حفاظت کرتی اور ان کے مطابق معاملات کے فیصلے کرتی ہے اسے اسلامی مملکت کہتے ہیں۔

آئندہ خطبات میں یہ بتایا جائے گا کہ یہ مستقل اقدار کیا ہیں۔

دوسرا خطبہ:

قانونِ مکافاتِ عمل

قال اللہ تعالیٰ: فَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ خَيْرًا يَّرَهٗ ۝ وَمَنْ يَّعْمَلْ مِثْقَالَ ذَرَّةٍ شَرًّا يَّرَهٗ ۝ (99:7-8)

اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ جو شخص ایک ذرّہ برابر بھی بھلائی کرتا ہے اسے اس کی جزاء ملتی ہے اور جو شخص ایک ذرّہ برابر بُرائی کرتا ہے اسے اس کی سزا ملتی ہے۔

پچھلے خطبہ میں یہ بتایا گیا تھا کہ دین ہمیں مستقل اقدار دیتا ہے۔ جو کام ان مستقل اقدار کے مطابق کیا جائے اسے نیکی کہتے ہیں۔ جو ان کے خلاف کیا جائے وہ بُرائی کہلاتی ہے۔ پیشتر اس کے کہ یہ بتایا جائے کہ وہ مستقل اقدار کیا ہیں جنہیں اللہ تعالیٰ نے حضور نبی اکرم ﷺ پر نازل کردہ وحی کے ذریعے قرآن مجید میں عطا کیا ہے، ایک اور بات کا سمجھ لینا نہایت ضروری ہے۔

آپ کو معلوم ہے کہ ہمارے ہاں ٹریفک کا قانون یہ ہے کہ سڑک کے بائیں ہاتھ چلو۔ آپ کسی ایسے چوراہے پر کھڑے ہو جائیں جہاں عام طور پر تانگے۔ سائیکل وغیرہ آتے جاتے ہوں۔ آپ دیکھیں گے کہ تانگے والا دور سے دیکھے گا کہ چوراہے پر ٹریفک کا سپاہی ہے یا نہیں۔ اگر سپاہی کھڑا ہے تو وہ بائیں ہاتھ چل کر موڑ مڑے گا۔ لیکن اگر سپاہی

نہیں ہے تو وہ جھٹ سے دائیں ہاتھ کی طرف ہو لے گا۔ اگر سپاہی کہیں چھپا کھڑا ہے تو وہ تانگے والے کو پکڑ لے گا اور اسے اس قانون شکنی کی سزا ملے گی۔ اگر سپاہی وہاں فی الواقعہ موجود نہیں تو تانگے والا دَن دناتا ہوا چلا جائے گا۔ کوئی اُسے پوچھے گا بھی نہیں۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ تانگے والے نے غلط کام تو کیا ہے لیکن اسے اس کی سزا نہیں ملی۔

یا اگر وہاں سپاہی موجود ہے اور وہ دیانتدار نہیں تو تانگے والا اُسے دو چار آنے کے پیسے دے کر چھوٹ جائے گا۔ اس صورت میں بھی وہ اپنے جرم کی سزا سے بچ جائے گا۔ یا اگر سپاہی نے اس کا چالان کر دیا ہے لیکن (بدقسمتی سے) مجسٹریٹ دیانتدار نہیں تو بھی مجرم سزا سے بچ جاتا ہے۔ آپ غور کیجئے کہ کتنے لوگ ہیں جو قانون شکنی کے باوجود اس طرح سزا سے بچ جاتے ہیں اور دل میں خوش ہوتے اور فخر کرتے ہیں کہ ہم سب کچھ کرتے ہیں لیکن ہمارا کوئی بال بیکا نہیں کر سکتا۔

قانون شکنی اور اس کی سزا کی ایک صورت تو یہ ہے۔ اب دوسری صورت دیکھئے۔ ہمارے محلے میں ایک شخص بیمار تھا۔ ڈاکٹر نے اس کے مرض کی تشخیص کی۔ دوائی دی اور ساتھ ہی تاکید سے کہہ دیا کہ تم نے میٹھا نہیں کھانا۔ اگر ایسا کرو گے تو مرض بڑھ جائے گا۔ ڈاکٹر بڑا قابل تھا۔ علاج بھی نہایت عمدگی سے ہو رہا تھا۔ لیکن مریض کو فائدہ ہونے کے بجائے، دن بدن اس کی حالت خراب ہوتی جا رہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب اس سے پوچھتے کہ تم میٹھا تو نہیں کھاتے۔ وہ پورے یقین کے ساتھ کہہ دیتا کہ بالکل نہیں۔ ڈاکٹر صاحب کی سمجھ میں بات نہیں آتی تھی کہ آخر ماجرا کیا ہے۔ اسے آرام کیوں نہیں آتا۔ ایک دن جبکہ کمرے میں کوئی نہیں تھا۔ مریض کی بیوی نے دیکھا کہ وہ چپکے سے میٹھا کھا رہا ہے۔ وہ جھٹ سے اوپر جا پہنچی اور اس سے کہا کہ آپ یہ کیا کر رہے ہیں؟ اُس نے کہا کہ اس وقت کون سے ڈاکٹر صاحب دیکھ رہے تھے۔ میں تو ہر روز ایسا ہی کرتا ہوں۔

آپ نے غور کیا کہ تانگے والے نے بھی حکم کی خلاف ورزی کی اور اس بیمار نے بھی حکم کی خلاف ورزی کی۔ تانگے والے کو اگر کسی نے نہیں دیکھا تو اس کا کچھ نقصان نہیں ہوا۔ وہ حکم کی خلاف ورزی کی سزا سے بچ گیا۔ لیکن یہ مریض، ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا سے نہیں بچ سکا۔ یہ اُس کے حکم کے خلاف میٹھا کھاتا رہا اور اس کی سزا یہ تھی کہ اس کی بیماری برابر بڑھتی رہی۔ اس سے اس پر کوئی فرق نہیں پڑا کہ اِسے کوئی شخص دیکھتا تھا یا نہیں دیکھتا تھا۔ ڈاکٹر وہاں موجود تھا یا نہیں تھا۔ فرض کیجئے کہ اسے کوئی شخص میٹھا کھاتے دیکھ لیتا اور وہ اُسے دس روپے دے کر اس کی منت کرتا کہ یہ بات ڈاکٹر کو نہ بتانا۔ اس صورت میں بھی وہ اپنے جرم کی سزا سے بچ نہیں سکتا تھا۔ میٹھا اپنا مضر اثر برابر کئے جاتا۔ اس کی تکلیف بڑھتی چلی جاتی۔ اس سے ظاہر ہے کسی کو اس قسم کے جرم کی سزا سے نہ رشوت بچا سکتی ہے نہ سفارش جو اس قسم کا جرم کرتا ہے اُسے اس کی سزا بھگتنی پڑتی ہے۔ دنیا کی کوئی طاقت اُسے اس سزا سے بچا نہیں سکتی۔

ایک اور شخص کا واقعہ سنیے۔ اس کی صحت بڑی اچھی تھی اور وہ فخر سے لوگوں سے کہا کرتا تھا کہ دیکھئے! سال بھر ہوا، ڈاکٹروں نے مجھ سے کہہ دیا تھا کہ اگر تم نے میٹھا کھانا کم نہ کیا تو مر جاؤ گے۔ میں برابر میٹھا کھا رہا ہوں۔ لیکن میرا کچھ بھی نہیں بگڑا۔ ایک دن معلوم ہوا کہ وہ اچھا بھلا سویا۔ آدھی رات

کے وقت اُسے دورہ سا پڑا۔ صبح ڈاکٹر کے ہاں لے گئے تو اس نے کہا کہ اس کے بچنے کی بہت کم اُمید ہے۔ یہ مسلسل میٹھا کھاتا رہا ہے۔ اس نے اس کی حالت سخت خراب کر دی ہے۔ آپ سمجھے کہ اس کا مطلب کیا ہے؟ مطلب یہ کہ اس شخص پر میٹھا اپنا اثر برابر کر رہا تھا۔ لیکن اسے اس کا احساس نہیں ہوتا تھا۔ وہ مضر اثر بڑھتا چلا گیا۔ تا آنکہ ایک دن اس کی حالت اس قدر خراب ہوگئی کہ اس کی جان کے لالے پڑ گئے۔ یعنی اُسے ڈاکٹر کے حکم کی خلاف ورزی کی سزا تو برابر مل رہی تھی لیکن وہ اسے محسوس نہیں کرتا تھا تا آنکہ ایک دن مرض نے اسے سختی سے پکڑ لیا۔ اس سے معلوم ہوا کہ بعض جرائم ایسے ہیں کہ ان کی سزا کا اثر بہت دیر میں جا کر نمودار ہوتا ہے۔ مجرم سمجھتے ہیں کہ ہمارا کچھ نہیں بگڑ رہا لیکن یہ ان کی بھول ہوتی ہے۔ اندر ہی اندر ان کا سب کچھ بگڑ رہا ہوتا ہے۔

اب ایک اور مثال سنیے۔ ایک شخص محنت مزدوری کر کے کچھ کماتا ہے اور اپنی حلال کی کمائی سے گھی خرید کر لاتا ہے۔ گھی کھانے سے اس کی طاقت بڑھتی ہے۔ دوسرا شخص کسی کی جیب کاٹتا ہے اور پولیس کی گرفت سے بچ جاتا ہے۔ وہ جو روپیہ اس طرح حاصل کرتا ہے اس کا گھی خرید کر لاتا ہے۔ گھر کھانے سے اس کی بھی طاقت ویسے ہی بڑھتی ہے جیسے پہلے شخص کی۔ یعنی جہاں تک انسان کے جسم کی صحت اور طاقت کا تعلق ہے، گھی یکساں اثر کرتا ہے خواہ وہ حلال کی کمائی سے خریدا جائے یا حرام کی کمائی سے۔ اس سے بظاہر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ شخص (جس نے چوری کے روپے سے گھی خریدا تھا) اپنے جرم کی سزا سے بالکل بچ گیا۔ یہ پولیس کی گرفت سے بچ نکلا اس لئے اسے عدالت سے سزا نہ ملی اور خالص گھی کھاتا رہا اس لئے (میٹھا کھانے والے مریض کی طرح) اس کی صحت پر بھی بُرا اثر نہ پڑا۔ اس سے لوگ یہ سمجھ لیتے ہیں کہ اگر انسان ایسا انتظام کر لے کہ وہ پولیس کی گرفت میں نہ آ سکے۔ یا اسے عدالت سزا نہ دے۔ تو پھر اس کے جرم کی سزا کہیں سے نہیں ملتی۔

قرآنِ کریم کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ چوری کے پیسوں کا گھی کھانے سے انسان کے جسم پر کوئی بُرا اثر نہیں پڑتا۔ لیکن انسان کے جسم کے علاوہ ایک اور چیز بھی ہے جسے اس کی ذات کہتے ہیں۔ حلال کی کمائی سے انسان کی ذات میں طاقت آتی ہے۔ حرام کی کمائی سے جو کچھ کھایا جائے اس سے اس کی ذات بیمار ہو جاتی ہے۔ اس چیز سے انسان کو کوئی نہیں بچا سکتا۔ وہ پولیس کی گرفت سے بچ جائے۔ وہ عدالت کو رشوت دے کر یا سفارش پہنچا کر یا کسی اور طریق سے اپنا اثر ڈال کر، بری ہو جائے۔ لیکن اسے اس کے جرم کی سزا مل کر رہتی ہے۔ یہ سزا اس کے جسم کو نہیں بلکہ اس کی ذات کو ملتی ہے۔ اس سے اُسے کوئی نہیں بچا سکتا۔

سوال یہ ہے کہ یہ سزا کون دیتا ہے۔ اللہ تعالیٰ کا ارشاد ہے کہ ہم نے ایسا قانون مقرر کر رکھا ہے کہ جو لوگ مستقل اقدار کے مطابق زندگی بسر کریں، انہیں اس کا عمدہ اور خوشگوار بدلہ ملے اور جو لوگ ان اقدار کی خلاف ورزی کریں، انہیں اس کی سزا ملے۔ خدا کا یہ قانون اس قدر محکم اور مضبوط ہے کہ اس کی زد سے کوئی نہیں بچ سکتا۔ اِنَّ بَطْشَ رَبِّكَ لَشَدِيْدٌ ﴿۱۲﴾ (85:12) ''یہ حقیقت ہے کہ تیرے رب کی گرفت بڑی سخت ہوتی ہے۔'' اس قانون کو جس کے مطابق انسان کے ہر ایک کام کی جزاء یا سزا مل کر رہتی ہے، قانونِ مکافاتِ عمل کہتے ہیں۔ یعنی انسانی اعمال کے بدلہ

ملنے کا قانون۔ آپ پولیس والے کی نگاہ سے بچ سکتے ہیں لیکن خدا کے اس قانون کی نگاہ سے نہیں بچ سکتے۔ وہ خدا جس کی کیفیت یہ ہے کہ یَعۡلَمُ خَآئِنَۃَ الۡاَعۡیُنِ وَمَا تُخۡفِی الصُّدُوۡرُ ﴿۱۹﴾ (40:19) ''جو نگاہوں کی خیانت اور دل میں چھپائے ہوئے ارادوں تک سے واقف ہے۔'' یعنی اس کا قانونِ مکافات صرف اُسی وقت گرفت نہیں کرتا جب کوئی شخص جرم کا مرتکب ہوجائے۔ وہ اُس وقت گرفت کرتا ہے جب جرم کا خیال اس کے دل میں پیدا ہو۔ اس کا ارشاد ہے کہ وَنَعۡلَمُ مَا تُوَسۡوِسُ بِہٖ نَفۡسُہٗ ۚ وَنَحۡنُ اَقۡرَبُ اِلَیۡہِ مِنۡ حَبۡلِ الۡوَرِیۡدِ ﴿۱۶﴾ (50:16) ''انسان کا دل جو وسوسے اس کے اندر پیدا کرتا ہے ہم انہیں بھی جانتے ہیں۔ (جانیں کیوں نہ؟) ہم اس کی رگِ جان سے بھی زیادہ اس کے قریب ہیں۔'' ہم نے اپنے قانونِ مکافاتِ عمل کی میزان کھڑی کر رکھی ہے جس میں ہر شخص کے اعمال (بلکہ اس کے خیالات اور ارادے) تُلتے رہتے ہیں۔ فَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ خَیۡرًا یَّرَہٗ ﴿۷﴾ (99:7) ''سو جو شخص ذرّہ بھر بھی بھلائی کرتا ہے وہ بھی اس کے سامنے آجاتی ہے'' وَمَنۡ یَّعۡمَلۡ مِثۡقَالَ ذَرَّۃٍ شَرًّا یَّرَہٗ ﴿۸﴾ (99:8) ''اور جو شخص ذرّہ برابر بھی بُرائی کرتا ہے وہ بھی اس کے سامنے آجاتی ہے۔ ان جرائم کی سزا سے کوئی شخص کسی صورت میں بھی بچ نہیں سکتا۔ لَّا تَجۡزِیۡ نَفۡسٌ عَنۡ نَّفۡسٍ شَیۡئًا (2:48)۔ اس بارے میں کوئی شخص کسی دوسرے شخص کے کام نہیں آسکتا۔ وَلَا یُقۡبَلُ مِنۡہَا شَفَاعَۃٌ (2:48) نہ ہی اس سے کوئی سفارش قبول کی جاسکتی ہے۔ وَّلَا یُؤۡخَذُ مِنۡہَا عَدۡلٌ (2:48) نہ ہی کوئی شخص کچھ معاوضہ دے کر چھوٹ سکتا ہے۔ وَّلَا ہُمۡ یُنۡصَرُوۡنَ ﴿۴۸﴾ (2:48) اور نہ ہی ایسے لوگوں کو کسی قسم کی مدد دی جاسکتی ہے۔ یہ ہے خدا کا قانونِ مکافات۔

مسلمان وہ ہے جو خدا کے اس قانونِ مکافاتِ عمل پر پورا پورا یقین رکھے۔ اسی کو ایمان کہتے ہیں۔ یاد رکھیئے! جو شخص قانون شکنی کرتے وقت یہ سمجھتا ہے کہ مجھے کون دیکھتا ہے۔ یا جو شخص یہ سمجھتا ہے کہ میں رشوت دے کر۔ سفارش پہنچا کر یا اپنا اثر ڈال کر جُرم کی سزا سے بچ جاؤں گا وہ خدا کے قانونِ مکافات پر ایمان نہیں رکھتا۔

چونکہ اسلامی مملکت، قوانینِ خداوندی کو دُنیا میں نافذ کرنے کا ذریعہ ہوتی ہے اس لئے اس مملکت میں کوئی مجرم اپنے جرم کی سزا سے نہیں بچ سکتا۔ اس میں نہ رشوت کام دے سکتی ہے نہ سفارش۔ نہ کسی کا اثر ورسوخ کچھ کرسکتا نہ اس کا عہدہ یا مرتبہ اس کے کسی کام آسکتا ہے۔ اس میں جو شخص قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے وہ اپنے کئے کی سزا پاتا ہے۔ جو قانون کا احترام کرتا ہے وہ عزت اور امن کا مستحق ہوتا ہے۔ یہ غیر متبدل اصول ہے۔ یہ مستقل قدر ہے جسے کوئی نہیں بدل سکتا۔ والسلام

تیسرا خطبہ:

دیر ہے، اندھیر نہیں

قال اللہ تعالیٰ: اِنَّہٗ لَا یُفۡلِحُ الظّٰلِمُوۡنَ ﴿۲۱﴾ ---- (6:21)

ارشادِ خداوندی ہے کہ اس بات پر اچھی طرح سے یقین رکھو کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھ سکتی۔ ظلم کرنے والے کبھی کامیاب نہیں ہوسکتے۔

گزشتہ خطبہ میں ہم نے بتایا تھا کہ خدا کے قانونِ

مکافات کے مطابق انسان کا ہر کام نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے۔ جو بھلائی کرتا ہے اسے اس کی جزاء ملتی ہے۔ جو برائی کرتا ہے وہ اس کی سزا پاتا ہے۔ خدا کے اس قانون میں کبھی کوتاہی نہیں ہوتی۔ اس میں کوئی شخص کمی بیشی نہیں کرسکتا۔ وہ خطبہ سننے کے بعد ایک شخص میرے پاس آیا اور کہنے لگا کہ جو کچھ آپ نے کہا تھا اس پر ہمارا ایمان تو ہے کیونکہ وہ اللہ تعالیٰ کا فرمان ہے۔ لیکن معاف فرمایئے۔ ہم جو کچھ دنیا میں اپنی آنکھوں سے دیکھتے ہیں وہ اس کے بالکل برعکس ہے۔ خدا کا فرمان تو یہ ہے کہ ظالم کی کھیتی کبھی پروان نہیں چڑھتی۔ ظلم کبھی کامیاب نہیں ہوسکتا۔ بددیانتی اور بے ایمانی ہمیشہ نقصان دیتی ہے جو دوسرے کا بُرا کرتا ہے اس کا ہمیشہ بُرا ہوتا ہے۔ جو مظلوم کو ستاتا ہے وہ کبھی چین سے نہیں بیٹھ سکتا۔ جو غریبوں کو لوٹتا ہے وہ تباہ اور برباد ہوجاتا ہے۔ جو کمزوروں پر ہاتھ اٹھاتا ہے اس کے ہاتھ ٹوٹ جاتے ہیں۔ جو کسی کے لئے کنواں کھودتا ہے وہ خود کنوئیں میں گرتا ہے۔ لیکن ہم دیکھتے یہ ہیں کہ دُنیا میں ہوتا اس کے بالکل اُلٹ ہے۔ دور کیوں جائیں۔ ہم نے خود پاکستان میں جو کچھ ہوتے دیکھا ہے وہ اس کی زندہ شہادت ہے کہ ظالم کی کھیتی پروان چڑھتی ہے اور مظلوم ہمیشہ تباہ اور برباد ہوتا ہے۔ دولت مند لوگ اپنی دولت کے نشے میں بدمست سب کچھ کرتے ہیں اور انہیں کوئی پوچھنے والا نہیں ہوتا۔ وہ غریبوں پر ہر قسم کا ظلم ڈھاتے ہیں۔ وہ ان کی محنت کی کمائی اُن سے زبردستی چھین لیتے ہیں۔ اُن کے ہاتھوں نہ ان غریبوں کی جان محفوظ ہوتی ہے نہ مال۔ نہ عزت بچ کر رہتی ہے نہ آبرو۔ وہ دربدر دھکے کھاتے ہیں۔ ایک ایک کا دروازہ کھٹکھٹاتے ہیں۔ وہ ہر صاحبِ اقتدار سے عدل وانصاف کی بھیک مانگتے ہیں۔ لیکن ان کی جھولی میں کہیں سے ایک ٹکڑا نہیں پڑتا۔ ان ظالموں، خونخواروں کے گُتے ریشمی گدوں پر سوتے ہیں اور بیچاری بیواؤں کے یتیم بچوں کو سردی سے بچنے کے لئے لحاف تک نصیب نہیں ہوتا۔ معاف فرمایئے! میری سمجھ میں نہیں آتا کہ خدا کا قانونِ مکافات کہاں چلا جاتا ہے؟ ہمیں بتایا یہ جاتا ہے کہ دیانتداری سے کاروبار میں برکت ہوتی ہے۔ لیکن ہم نے دیکھا یہ ہے کہ کاروبار چلتا ہی اس کا ہے جو بددیانتی کرے۔ ایمانداری سے کام کرنے والا چاردن میں اپنی پونجی بھی ضائع کر کے بیٹھ جاتا ہے لیکن بددیانتی کرنے والے سونے کے محلات بناتے چلے جاتے ہیں۔ معلوم نہیں خدا کا قانونِ مکافات کون سی دنیا میں چلتا ہے۔ ہماری دنیا میں تو یہی قانون ہے کہ جس کی لاٹھی اُس کی بھینس۔ ہمارے ہاں تو مسلسل یہی قانون چلتا آرہا ہے۔

جس شخص نے ہم سے یہ باتیں کیں وہ بڑا دکھی تھا۔ ہم نے بڑے اطمینان اور سکون سے ان باتوں کو سُنا۔ یہ باتیں تنہا اُس ایک شخص کے دل کی آواز نہیں تھی۔ ہزاروں، لاکھوں مظلوم انسان ہیں جن کے دل میں اسی قسم کے خیالات آتے ہیں۔ ان میں سے بعض لوگ ان خیالات کو زبان تک لے آتے ہیں۔ باقی اپنے دل کے اندر رکھتے ہیں۔ یہ خیالات ایسے نہیں جنہیں یونہی سُن کر ٹال دیا جائے۔ ان پر سنجیدگی سے غور کرنا چاہئے اور ٹھنڈے دل سے سوچنا چاہئے کہ اگر خدا کا قانونِ مکافات برحق ہے (اور اس کے برحق ہونے میں کسے شبہ ہوسکتا ہے؟) تو پھر دنیا میں ایسا کیوں ہوتا ہے؟

بات بڑی اہم ہے اس لئے اسے بڑی توجہ سے سُننا

چاہئے۔ اسے ایک مثال سے سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ اکتوبر، نومبر کا مہینہ ہے۔ زمینیں گیہوں کی بوائی کے لئے تیار ہیں۔ اُن دنوں کسانوں کے گھروں میں عام طور پر غلے کی کمی ہوتی ہے لیکن انہوں نے بیج کے لئے غلہ سنبھال کر رکھا ہوتا ہے۔ دو کسان ہیں جن کے گھروں میں فاقوں تک کی نوبت آ رہی ہے۔ ان میں سے ایک کسان اپنے بیج کا غلہ لیتا ہے اور چکی پر جا کر آٹا پسوالاتا ہے۔ اس کے گھر میں رات کو تازہ تازہ گیہوں کی روٹیاں پکنے لگ جاتی ہیں۔ وہ اور اس کے بیوی بچے پیٹ بھر کر روٹی کھاتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں کہ ان کی مصیبت کٹ گئی۔ دوسرا کسان غلہ باہر لے جاتا ہے اور کھیت میں بیج ڈال دیتا ہے۔ اس کے گھر میں بدستور تنگی رہتی ہے۔ اسے اور اس کے بیوی بچوں کو گیہوں کی روٹی دیکھنی تک نصیب نہیں ہوتی۔ یہ ہر روز کھیت پر جاتا ہے اور دن بھر محنت کرتا ہے۔ لیکن شام کو پھر خالی ہاتھ واپس گھر آ جاتا ہے۔ دوسرا کسان اپنا بیل بیچ کر چند دن کے لئے پھر مزے اڑاتا ہے۔ پھر زمین رہن رکھ دیتا ہے اور بڑی خوشحالی سے دن گزارتا ہے۔ لیکن اس کا ہمسایہ سخت مصیبت کے دن کاٹتا ہے۔ ایک مہینہ، دو مہینے، تین مہینے، چار مہینے، پانچ مہینے، چھ مہینے صبح سے شام اور شام سے صبح، برابر محنت کرتا ہے لیکن اسے کھیت میں سے ایک وقت کی روٹی بھی نہیں ملتی۔ اس کے بچے اس سے برابر پوچھتے رہتے ہیں کہ بابا! ہمارا ہمسایہ کوئی کام نہیں کرتا اور وہ اس کے بچے عیش اڑاتے ہیں، ہم دن رات محنت کرتے رہتے ہیں اور ہمیں ٹکڑا تک نصیب نہیں ہوتا۔ ہم نے سُنا تھا کہ محنت اپنا پھل لاتی ہے لیکن ہماری محنت تو کوئی پھل نہیں لاتی۔ ہم تو محنت کرتے ہیں اور خالی ہاتھ گھر آ جاتے ہیں وہ ان سے کہتا ہے کہ بیٹا! محنت اپنا پھل لاتی ہے۔ خدا کا قانون بالکل سچا ہے۔ لیکن بیج بونے اور فصل پکنے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ ایک مدت ہوتی ہے کوئی شخص اس وقفے کو کم نہیں کر سکتا۔ جو شخص ہمت اور استقلال سے اس دوران میں محنت کئے جاتا ہے اور حوصلہ نہیں ہارتا، اس کی محنت اپنے وقت پر پھل لا کر رہتی ہے۔ وہ انہیں یہ نصیحتیں کرتا رہتا ہے کہ اتنے میں کٹائی کے دن آ جاتے ہیں اور اس کسان کا سارا گھر غلے سے بھر جاتا ہے۔ اس کی محنت بالآخر پھل لاتی ہے: كَمَثَلِ حَبَّةٍ اَنْۢبَتَتْ سَبْعَ سَنَابِلَ فِيْ كُلِّ سُنْۢبُلَةٍ مِّائَةُ حَبَّةٍ ؕ (2:261) ''اس دانے کی طرح جو سات بالیں اگائے اور ہر ایک بال میں سو سو دانے ہوں۔'' اس طرح اس دیانتدار محنت کش کسان کو ایک ایک دانے کے بدلے سات سات سو دانے ملتے ہیں۔ اس کے برعکس دوسرا کسان جس نے خدا کے قانون کو چھوڑ کر، بیج کے دانے پسوا لئے تھے، اس کا نہ گھر رہا نہ بار، نہ ڈھور ہے نہ ڈنگر۔ نہ کھیتی رہی نہ زمین۔ وہ مفلس اور قلاش ہو کر در بدر کی بھیک مانگنے لگ گیا۔

یہ کیفیت ہے خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل کی۔ وہ بالکل برحق ہے۔ لیکن بیج کے بونے اور کھیتی کے پکنے میں وقت ضرور لگتا ہے۔ جو اس سے تنگ نہیں آتا اور ہمت اور استقلال سے تمام مشقتوں کو برداشت کرتا ہے اس کی کھیتی پروان چڑھ جاتی ہے۔ جو مایوس ہو کر، زمین میں بیج نہیں ڈالتا۔ یا جلد بازی میں سبز گیہوں بیلوں کو چرا دیتا ہے، وہ آخر الامر تباہ اور برباد ہو جاتا ہے۔ یہی مثال ظالم کی ہے۔ اس کی کھیتی کبھی نہیں پنپتی۔ لیکن اس کے ظلم کرنے اور ظلم کا نتیجہ برآمد ہونے میں ایک وقفہ ہوتا ہے۔ اگر وہ اس مہلت کے وقفے میں سمجھ جائے۔ اُسے ہوش آ جائے اور وہ ظلم کو چھوڑ کر مظلوموں کی امداد کرنے لگ جائے۔ وہ غریبوں سے ہمدردی کرے۔ وہ عدل اور انصاف کے راستے ہموار کر دے۔ وہ دیانت اور امانت پر کاربند ہو جائے۔ تو اس کے یہ نیک کام اس کی سابقہ برائیوں کے داغوں کو دھو ڈالتے ہیں۔ لیکن اگر

وہ ایسا نہ کرے اور اپنے ظلم اور سرکشی میں بڑھتا ہی چلا جائے تو پھر خدا کا قانون ایسے لوگوں سے پکار کر کہتا ہے کہ اِنَّا لَقٰدِرُوْنَ ﴿۴۰﴾ عَلٰٓی اَنْ نُّبَدِّلَ خَیْرًا مِّنْھُمْ ۙ وَمَا نَحْنُ بِمَسْبُوْقِیْنَ ﴿۴۱﴾ (70:40-41) ''ہم اس پر قادر ہیں کہ ان کی جگہ ایسے لوگوں کو لے آئیں جو ان سے بہتر ہوں۔ دنیا میں کوئی قوت ایسی نہیں جو ہمیں ایسا کرنے سے روک دے۔ جو ہمیں عاجز کر دے۔ جو ہم سے آگے بڑھ جائے۔ چنانچہ وہ لوگ، جو ان سے بہتر ہوتے ہیں آتے ہیں اور ان کے ظلم اور سرکشی کے راستوں کو روک کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اور ان کی کلائیاں توڑ دیتے ہیں۔ یوں خدا کا قانونِ مکافات عذاب بن کر ان کے سر پر مسلط ہو جاتا ہے۔ سورہ انبیاء میں قرآن کریم نے ان کی اس کیفیت کو بڑے دلکش اور عبرت انگیز انداز میں بیان کیا ہے۔ جہاں کہا ہے کہ وَ کَمْ قَصَمْنَا مِنْ قَرْیَۃٍ کَانَتْ ظَالِمَۃً وَّاَنْشَاْنَا بَعْدَھَا قَوْمًا اٰخَرِیْنَ ﴿۱۱﴾ (21:11) ''کتنی ہی بستیاں ہم نے تباہ اور برباد کر دیں جن کے رہنے والے ظالم تھے۔ اور ان کے بعد ہم نے (ان کی جگہ) دوسرے لوگوں کو اٹھا کھڑا کیا۔'' فَلَمَّآ اَحَسُّوْا بَاْسَنَآ اِذَا ھُمْ مِّنْھَا یَرْکُضُوْنَ ﴿۱۲﴾ (21:12)۔ ان ظالموں کی حالت یہ تھی، (وہ اپنی سرکشیوں میں مست تھے اور انہیں اس کا کچھ علم نہیں تھا کہ ان کے اعمال کے نتائج برآمد ہونے کا وقت آ پہنچا ہے۔ چنانچہ) جب انہوں نے ہمارے عذاب کو محسوس شکل میں اپنے سامنے دیکھا تو اس سے بھاگنے لگے۔ ہمارے قانونِ مکافات نے پکارا کہ: لَا تَرْکُضُوْا (21:13) اب مت بھاگو۔ (تم بھاگ کر کہیں نہیں جا سکتے)۔ وَارْجِعُوْٓا اِلٰی مَآ اُتْرِفْتُمْ فِیْہِ وَمَسٰکِنِکُمْ (21:13) وہ بڑے بڑے محلات (جو تم نے غریبوں پر ظلم کر کے تعمیر کئے تھے) وہ تمہاری آسائش گاہیں (جن میں تم نے عیش و عشرت کے سامان جمع کر رکھے تھے) تم ان کی طرف واپس چلو۔ لَعَلَّکُمْ تُسْئَلُوْنَ ﴿۱۳﴾ (21:13) تا کہ تم سے پوچھا جائے (کہ تم نے یہ دولت کہاں سے لی تھی)۔ انہیں اس طرح پکڑا جائے گا۔ قَالُوْا یٰوَیْلَنَآ اِنَّا کُنَّا ظٰلِمِیْنَ ﴿۱۴﴾ (21:14) اور وہ اس کا اقرار کریں گے کہ ہم نے واقعی لوگوں پر ظلم اور زیادتی سے یہ سب کچھ اکٹھا کیا تھا۔ فَمَا زَالَتْ تِّلْکَ دَعْوٰىھُمْ حَتّٰی جَعَلْنٰھُمْ حَصِیْدًا خٰمِدِیْنَ ﴿۱۵﴾ (21:15) وہ ایسا پکارتے رہیں گے۔ (لیکن اس وقت ان کا یہ اعتراف اور اقرار انہیں کچھ فائدہ نہیں دے گا)۔ ہمارا قانونِ مکافات انہیں ایسا بنا دے گا جیسے کٹے ہوئے کھیت۔ یا بجھے ہوئے شعلے (کہ جن کی صرف راکھ باقی رہ جائے)۔ یوں خدا کا قانونِ مکافات، ظالموں اور سرکشوں کو آخر الامر تباہ، اور برباد کر دیتا ہے۔

لیکن جن لوگوں کے ہاتھوں وہ انہیں تباہ اور برباد کراتا ہے ان سے واضح الفاظ میں کہہ دیتا ہے کہ تم یہ نہ سمجھ لینا کہ تم جو جی میں آئے کرو۔ تمہارا کچھ نہیں بگڑے گا۔ ثُمَّ جَعَلْنٰکُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ مِنْۢ بَعْدِھِمْ لِنَنْظُرَ کَیْفَ تَعْمَلُوْنَ ﴿۱۴﴾ (10:14) پھر ہم نے ملک میں تمہیں ان کا جانشین بنایا تا کہ ہم دیکھیں کہ تم کس قسم کے کام کرتے ہو۔ انہوں نے ظلم کیا تو وہ تباہ اور برباد ہو گئے۔ تم ظلم کرو گے تو تم بھی تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ خدا کا قانونِ مکافات نہ کسی پر ظلم کرتا ہے۔ نہ کسی کی رعایت کرتا ہے۔

مسلمان وہ ہے جو اس حقیقت پر یقین رکھے کہ عمل اور اس کے نتیجے میں وقفہ ضرور ہوتا ہے لیکن ایسا نہیں ہو سکتا کہ عملِ بد اپنا نتیجہ مرتب نہ کرے۔ ظلم کی کھیتی جھلس کر رہتی ہے خواہ اس میں کتنی دیر کیوں نہ لگے۔ والسلام

(مطبوعہ ماہنامہ طلوع اسلام 1979ء)

(جاری ہے)

خورشید انور، سوات

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

پاکستان میں قرآنی نظام کس طرح قائم ہو؟

(یہ مقالہ کنونشن 2017ء میں پڑھا گیا)

اِنَّ الدِّیۡنَ عِنۡدَ اللّٰہِ الۡاِسۡلَامُ ۔ (3:19) یعنی اللہ کے نزدیک دین یا نظام حیات اسلام ہی ہے۔

میرے عزیز دوستو آج طلوع اسلام کے سالانہ کنونشن میں جس موضوع پر مجھے اظہار خیال کا شرف حاصل ہو رہا ہے وہ ہے ''پاکستان میں قرآنی نظام کس طرح قائم ہوگا''۔ موضوع ایسا دلچسپ اور مقبول ہے جو ہم سب کے دل کی آواز ہے اور جس پر اگر گھنٹوں بولا جائے تو نہ بولنے والے کی تشنگی ختم ہوگی اور نہ سننے والوں کا ذوق تھکن کا شکار ہوگا۔ بحیثیت طلباء قرآن ہم سب کے ایمان کی ابتداء اس انکار سے ہوتی ہے کہ اسلام روایتی مذہب اور محض پوجا پاٹ اور چند رسومات کا مجموعہ نہیں ہے، جہاں سے ہمارا لا کا سفر خاردار شروع ہوتا ہے۔ لا کے اس سفر میں ہم غیر اللہ کے تمام غیر قرآنی مشرکانہ عقائد و تصورات کے بتوں کو تیشہ ابراہیمی سے توڑتے چلے جا رہے ہیں اور اس سفر میں قدم قدم پر آتش نمرود کا بھی سامنا ہے لیکن ہم یہ سب اذیتیں خندہ پیشانی سے اس لئے برداشت کرتے چلے جا رہے ہیں کہ ہمیں یقین کامل ہے الا اللہ کی اس منزل پر کہ روئے زمین پر اللہ کا نظام کی عملی طور پر قائم ہو کر رہے گا جیسا کہ قرآن کا دعویٰ ہے کہ:

سَنُرِیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا فِی الۡاٰفَاقِ وَفِیۡۤ اَنۡفُسِہِمۡ حَتّٰی یَتَبَیَّنَ لَہُمۡ اَنَّہُ الۡحَقُّ ؕ (41:53)

یعنی ہم کائنات اور ان کی اپنی نفسیات میں ایسی نشانیاں پیدا کرتے چلے جائینگے کہ ان پر خود بخود یہ حقیقت واضح ہو جائیگی کہ یہ (قرآنی نظام) حق ہے۔

اور اس نظام کے عملی قیام کا نتیجہ یہ ہوگا کہ:

وَاَشۡرَقَتِ الۡاَرۡضُ بِنُوۡرِ رَبِّہَا وَوُضِعَ الۡکِتٰبُ وَجِایۡٓءَ بِالنَّبِیّٖنَ وَالشُّہَدَآءِ (39:69)

اُس وقت زمین یعنی انسانی معاشرہ اللہ کی عالمگیر ربوبیت کے نور سے جگمگا اٹھے گی اور ہر معاملہ اللہ کے ضابطہ قوانین کے مطابق طے ہوگا اِسطرح زندگی کا وہ نقشہ مرتب اور مکمل ہو کر سامنے آجائیگا جس کیلئے انبیاء آتے رہے اور جماعت مومنین جس کی شہادت دیتی رہی۔ اُس دور میں لوگوں کے تمام معاملات کے فیصلے حق کے ساتھ ہونگے اور کسی پر کسی قسم کی زیادتی نہیں ہوگی۔ نہ ہی کسی کے حق میں کوئی کمی کی جائے گی۔

اقبال اپنے دلکش انداز میں اُس دور انقلاب کا نقشہ اس طرح کھینچتے ہیں ؎

آسماں ہوگا سحر کے نور سے آئینہ پوش — اور ظلمت رات کی سیماب پا ہو جائے گی

اِس قدر ہوگی ترنم آفریں بادِ بہار — نکہتِ خوابیدہ غنچے کی نوا ہو جائے گی

آملیں گے سینہ چاکانِ چمن سے سینہ چاک
بزمِ گل کی ہم نفس بادِ صبا ہوجائے گی
شبنم افشانی مری پیدا کرے گی سوز و ساز
اِس چمن کی ہر کلی درد آشنا ہوجائے گی
دیکھ لوگے سطوتِ رفتارِ دریا کا مآل
موجِ مضطر ہی اسے زنجیرِ پا ہوجائے گی
پھر دلوں کو یاد آجائے گا پیغامِ سجود
پھر جبیں خاکِ حرم سے آشنا ہوجائے گی
شب گریزاں ہوگی آخر جلوہ خورشید سے
یہ چمن معمور ہوگا نغمہ توحید سے

عزیزانِ گرامی!

قرآن حکیم کے اوراق اور تاریخ انسانی اس حقیقت کے شاہد ہیں کہ مکمل انکار یعنی صریحاً کفر کے معاشرہ میں توحق کے نظریات دلیل و برھان کی بنیاد پر رائج کرنا اتنا مشکل کام نہیں ہوتا لیکن مذہبی منافقت کے معاشرہ میں جہاں لوگ نظر بظاہر عقیدہ توحید کے پیروکار ہوتے ہیں لیکن حقیقتاً اس کی عملی تکذیب کرنے والے، ایسے معاشرے میں حق کی آواز آتش نمرود میں کودنے سے کم نہیں ہوتی۔ یہی وجہ ہے کہ انبیاء کے لئے بھی مذہب سے برگشتہ لوگ اتنا بڑا چیلنج ثابت نہیں ہوئے جتنا کہ مذہبی گروہ اور بزعمِ خویش اللہ کے ماننے والے۔ یہی چیلنج تحریک پاکستان میں قائداعظم کو بھی درپیش تھی اور اتفاقاً ہمیں اپنے ملک پاکستان میں بھی ایسے ہی چیلنج کا سامنا ہے۔

مسلمانوں کے اکثر فرقے اسلام کو بحیثیت نظام تسلیم ہی نہیں کرتے اور ایسے لوگ اسلام کو چند عقائد و مذہبی رسوم کا مجموعہ مانتے ہیں اور اسلام کو افراد کی انفرادی اصلاح اور اسی ذریعے سے آخرت کی نجات کا ذریعہ قرار دیتے ہیں۔ ان کا ایمان یہ ہے کہ یہ دنیا محض ایک کھیل ہے اور اس میں دلچسپی لینا شیطان کا دھوکہ ہے۔ جو انسان دنیا کے معاملات میں دلچسپی لیتا ہے وہ گمراہ ہے کیونکہ یہ دنیا مومن کیلئے قید خانہ ہے۔ قرآنی نظام جو عام اصطلاح میں اسلامی نظام کہلاتا ہے مسلمانوں میں بہت کم لوگ اسے ایک دینی تقاضے کے طور پر تسلیم کرتے ہیں۔ لیکن ستم بالائے ستم یہ کہ جو لوگ اسلام کو بطور نظام مانتے ہیں ان کا بھی نہ کوئی واضح تصور ہے اور نہ ہی ان کے پاس اُس نظام کا کوئی خاکہ، ہر فرقہ کے پیروکار غیر قرآنی نظام کے ماتحت بڑے اطمینان سے زندگی گذار رہے ہیں لیکن کسی دوسرے فرقے کے فقہ کے نفاذ کا سن کر علم جہاد بلند کر دیتے ہیں۔ ہر مذہبی سیاسی جماعت کسی نہ کسی فرقے کی نمائندہ ہے اور ہر جماعت کا منشور ہے اپنے ہی فرقے کے فقہ کا نفاذ۔ ہر فرقہ اپنی ڈیڑھ انچ کی مسجد میں پانچ وقت دست بہ دعا ہے کہ اس کے فقہ کا نفاذ ہو اور دیگر ساروں کو یا تو بزورِ شمشیر مسلمان کیا جائے اور یا پھر مرتد قرار دیکر واجب القتل قرار دیا جائے۔ ان حالات میں ان اسلامی نظام کے داعیوں کے بارے میں ہم جیسے تو یہی عرض کر سکتے ہیں کہ ؎

تِری دعا ہے کہ پوری ہو آرزو تیری
مِری دعا ہے تِری آرزو بدل جائے

قرآنی معاشرہ کا قیام اور اس کے نتیجے میں قرآنی نظام کا عملی نفاذ مملکت پاکستان کا بنیادی مقصد تھا۔ لیکن قرآن خارجی انقلاب کیلئے نفسیاتی تبدیلی کو بنیادی شرط قرار دیتا ہے۔

اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِھِمْ ط (13:11)

یعنی اللہ کسی قوم کی حالت کو (اس وقت تک) نہیں بدلتا جب تک وہ (قوم) اپنے نفسیات کو نہ بدلے۔

ہمارے معاشرے میں نسل در نسل ایسے تصورات ایمان کا جزو لاینفک مانے جاتے ہیں جن کا دین سے کوئی تعلق نہیں

لیکن پھر بھی ان کے بارے میں لب کشائی کو کفر خیال کیا جاتا ہے۔ فرقہ پرستی بھی ایک ایسا تصور ہے جس کو قرآن نے کھلے الفاظ میں شرک قرار دیا ہے لیکن اس کے باوجود آج کے مسلمان کیلئے یہ ضروری ہے کہ وہ کسی نہ کسی فرقہ کے ساتھ وابستہ ہو۔ اسطرح قرآن کے ساتھ ساتھ متعلقہ فرقہ کے عقائد ماننا ضروری ہیں اگرچہ وہ خلاف قرآن ہی کیوں نہ ہوں۔ بظاہر تو وہ خلاف قرآن نظر نہیں آتے کیونکہ قرآن کا ترجمہ اس انداز میں کیا گیا ہے کہ اس کا مفہوم یکسر بدل دیا گیا ہے لیکن جب ایسے تصورات پر غور کیا جائے تو وہ قرآن کی اساسی تعلیم کے خلاف نظر آتے ہیں۔ چنانچہ سارا معاشرہ دانستہ یا نادانستہ عملی شرک میں مبتلا ہے۔ فرقوں کو مسالک کا دلکش نام دیکر دین کا حصہ بنا دیا گیا ہے جن کا انکار کفر خیال کیا جاتا ہے۔ لیکن کسی میں یہ سوال کرنے کی جرات نہیں کہ اگر مسالک اور اسلام لازم وملزوم ہیں تو رسول اکرم ﷺ اور صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کا مسلک کونسا تھا؟ جب تک تمام مسلمان اپنے اپنے مسالک کا انکار کرکے اپنے اپنے فرقے سے لاتعلق ہوکر اور خارج از قرآن ہر اتھارٹی کو ایک طرف رکھ کر قرآن خالص کی طرف رجوع نہیں کرتے اس وقت تک نہ تو فرقہ پرستی کا خاتمہ ممکن ہے اور نہ ہی قرآنی معاشرے کا قیام اور قرآنی نظام کا عملی نفاذ۔ بہ الفاظ دیگر قرآنی نظام کی طرف پہلا قدم فرقہ پرستی کا خاتمہ ہے اور اس حقیقت کو اقبال نے بہت پہلے واضح کر دیا تھا۔

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

تکرار کیلئے معذرت لیکن سالِ گذشتہ کے کنونشن میں اپنی تقریر کے آخری پیرے کو میں ایک مرتبہ پھر آپ کے سامنے پیش کرنا ضروری سمجھتا ہوں جو اتفاقاً موضوع زیر بحث سے بہت زیادہ متعلق ہے۔

اس بات کا زبانی طور پر تو ہر مسلمان اقرار کرتا ہے کہ ملت اسلامیہ کے انحطاط کی وجہ فرقہ پرستی ہے لیکن اس کا حل کسی کے پاس نہیں سوائے قرآن خالص کے ماننے والوں کے۔ ابتداءً پاکستان میں اس لعنت سے نجات کا عملی طریقہ یہ ہوسکتا ہے کہ کوئی قرآنی علم رکھنے والا سربراہ مملکت یا سربراہ حکومت مجالس قانون ساز کو اعتماد میں لیکر فرقہ پرستی کے سوال پر ریفرنڈم کا اعلان کرے (جس کی گنجائش موجودہ آئین میں موجود ہے)۔ اور اس پر ذرائع ابلاغ میں ایک بھرپور مہم چلائیں کہ قرآن کے رو سے ملت اسلامیہ میں فرقوں کا وجود سراسر غیر اسلامی بلکہ شرک ہے۔ جس کو ختم کرنا ہر مسلمان کی دینی ذمہ داری ہے۔ ریفرنڈم میں فرقہ پرستی کے خاتمے کے حق میں عوامی رائے آنے کا قوی امکان ہے۔ اس طرح فرقہ پرستی کو قانونی طور پر شرک قرار دیکر حکومت یہ اعلان کرے کہ وہ تمام لوگ جو قرآن کو بطور محکم دلیل مانتے ہیں وہ اپنے اپنے فرقوں سے لاتعلقی کا اظہار کریں۔ اور ایک جھنڈے تلے آجائیں۔ فرقوں کے اختلافی قوانین کو مجالس قانون ساز کے ذریعے ہر فرقے کے نمائندگان کی موجودگی میں ذیلی کمیٹیوں میں زیر بحث لایا جائے اور یوں قرآنی تعلیمات کی روشنی میں تمام قوانین کو ایک ایک کرکے ازسرنو مرتب کیا جائے یا ان میں ترامیم کی جائیں۔ اور مسلمانوں کی اجتماعی دانش کے اس فیصلے کو سختی سے نافذ کیا جائے۔ یہ جمہوری انداز میں ایک پرامن قرآنی انقلاب ہوگا لیکن اس پورے عمل کیلئے پارلیمنٹیرئینز کا فہمِ قرآن لازمی ہے۔ لہٰذا ہمیں اب اس بات پر سوچنا پڑے گا کہ کسطرح معاشرے کے سرکردہ رہنماؤں کو قرآن کا پیغام پہنچائیں۔ کیا پتہ کہ کب پاسباں مل جائیں کعبے کو صنم خانے سے۔

جہانِ تازہ کی افکارِ تازہ سے ہے نمود کہ سنگ وخشت سے ہوتے نہیں جہاں پیدا

قرآن حکیم کے طالب علموں کے لیے خوشخبری

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے سات سو سے زائد دروسِ قرآنی پر مبنی تفسیری سلسلہ کے تحت بزم طلوع اسلام لاہور کی طرف سے مندرجہ ذیل تفسیری کتب کی اشاعت الگ الگ جلدوں میں ہو چکی ہے۔ یہ جلدیں 20x30/8 کے بڑے سائز کے بہترین کاغذ پر خوبصورت طباعت اور مضبوط جلد بندی کے ساتھ دستیاب ہیں۔ جن کی تفصیل درج ذیل ہے۔

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ	نام کتاب	سورہ نمبر	صفحات	نیا ہدیہ
سورہ الفاتحہ	(1)	240	200/-	سورۃ الانبیآء	(21)	336	300/-
سورہ الفاتحہ (سٹوڈنٹ ایڈیشن)	(1)	240	110/-	سورۃ الحج	(22)	380	350/-
سورۃ البقرہ (اول)	(2)	500	400/-	سورۃ المؤمنون	(23)	408	400/-
سورۃ البقرہ (دوم)	(2)	538	400/-	سورۃ النور	(24)	264	350/-
سورۃ البقرہ (سوم)	(2)	500	400/-	سورۃ الفرقان	(25)	389	350/-
سورہ آل عمران (اول)	(3)	472	500/-	سورۃ الشعرآء	(26)	454	400/-
سورہ آل عمران (دوم)	(3)	480	500/-	سورۃ النمل	(27)	280	300/-
سورۃ النساء	(4)	870	700/-	سورہ القصص	(28)	334	350/-
سورۃ المائدہ	(5)	450	500/-	سورہ عنکبوت	(29)	388	350/-
سورۃ الانعام	(6)	600	600/-	سورہ روم، لقمان، السجدہ	(30,31,32)	444	400/-
سورۃ الاعراف (اوّل)	(7)	480	500/-	سورہ احزاب، سبا، فاطر	(33,34,35)	570	400/-
سورۃ الاعراف (دوم)	(7)	زیر طبع		سورہ یٰسین	(36)	164	150/-
سورۃ انفال	(8)	210	250/-	سورہ الصّٰفّٰت، ص، زمر	(37,38,39)	450	400/-
سورہ توبہ	(9)	530	550/-	سورۃ مومن حٰمٓ سجدہ، سورہ شوریٰ	(40,41,42)	624	550/-
سورۂ یونس	(10)	360	400/-	سورۂ زخرف، دخان، جاثیہ، احقاف، محمدؐ	(43-44-45 46-47)	520	500/-
سورۃ ھود	(11)	400	400/-	سورۂ الفتح، الحجرات، ق، الذاریات، الطور، النجم	(48-49-50 51-52-53)	550	500/-
سورۃ یوسف	(12)	288	300/-	سورۂ القمر، الرحمٰن، واقعہ، الحدید	(54-55 56-57)	384	400/-
سورہ رعد، ابراہیم، الحجر	(13-15)	500	500/-	28 واں پارہ (مکمل) مجادلہ، حشر، ممتحنہ، صف، جمعہ، منافقون، تغابن، طلاق، تحریم	(58-59-60-61-62-63-64-65-66)	300	300/-
سورہ النحل	(16)	334	300/-				
سورہ بنی اسرائیل	(17)	396	400/-	29واں پارہ (مکمل)	----	544	400/-
سورۃ الکہف وسورہ مریم	(18-19)	532	500/-	30واں پارہ (مکمل)	----	624	400/-
سورہ طٰہٰ	(20)	416	350/-	شرح جاوید نامہ	----	800	1000/-

ادارہ طلوعِ اسلام B-25 گلبرگ 2، لاہور 54660، (پاکستان) فون نمبر: +92 42 3571 4546 +92 321 4460 787

بزم ہائے طلوع اسلام اور تاجر حضرات کو ان ہدیوں پر تاجرانہ رعایت دی جائے گی۔ ڈاک خرچ اس کے علاوہ ہوگا۔

اعجاز رسول، گلاسگو، یو کے
erasool@aol.com

عقل، قرآن اور انسانی مسئلہ
(اسلام کیا ہے؟ سے ماخوذ)

قرآن بہت Precise کتاب ہے۔ گویا کہ اسی طرح جیسے کیمسٹری کے فارمولے۔ ہم اس کی اقدار کے خلاف نہیں جا سکتے۔ الہٰذا اس کی اقدار کی طرف آہستہ آہستہ ہم آ کر ان کی اہمیت جان سکتے ہیں۔ انسانی عقل کبھی بھی آزادی سے اُس کام پر تیار نہیں ہوتی جس میں اُس کو اپنا فائدہ نظر نہ آئے۔

انسانی عقل ہماری خواہشات کو مکمل کرنے میں مدد کرتی ہے۔ خواہشات اور عقل صرف اپنا مفاد ہی سوچتی ہیں۔ ساری مذہب کی بنیاد اس پر ہے کہ کس قسم کا God وضع کیا جائے جس کو خوش کر کے اپنا مفاد حاصل کیا جا سکے۔

قرآن کی ساری بنیاد مکافاتِ عمل پر ہے۔ جو کہ انسانی اعمال پر مشتمل ہے کہ ہر انسان کا عمل اپنا نتیجہ مرتب کر کے رہتا ہے اور جس نے اس قانون کو وضع کیا ہے اور اُس پر عمل کروانا ہے وہ اللہ کی ذات ہے۔ جیسے کہ (45:22) میں قرآن نے کہا ہے انسانی عقل اور خواہشات کو اس قانون کی موجودگی اور افادیت کے متعلق آگاہ کرنا اور اُس کو قبول کرنا Absolutely essential ہے۔ اس کے بغیر قرآن کا دین اور نظام سمجھ میں نہیں آ سکتا۔ سوال یہ ہے کہ مکافاتِ عمل کا انسانی ذات کے ساتھ کیا تعلق ہے اور انسانی عقل کو اس پر کیسے آمادہ کیا جائے کہ یہ اُس کے اپنے فائدہ میں ہے کہ انسان اس قانون پر عمل کرے؟ پھر اس سے یہ سوال بھی پیدا ہوتا ہے کہ اگر انسانی معاشرہ میں انسانی مکافاتِ عمل کا نظام کمزور ہے تو انسان نہیں سمجھ سکتا ہے کہ یہی مکافاتِ عمل کافی ہے۔ مثلاً سرمایہ دارانہ نظام میں بالکل جائز ہے کہ کوئی بھی انسان جتنی دولت چاہے اکٹھی کر لے صرف یہ کہ وہ انسانی نظامِ حکومت کے ٹیکس وغیرہ کی ادائیگی کر دے۔ اس مکافاتِ عمل کا قرآنی مکافاتِ عمل کے ساتھ بہت کم تعلق ہے۔ مثلاً ہم اگر انسانی مکافاتِ عمل جو کہ دوسرے انسانوں کی محنت غبن کرنے پر مشتمل ہے اس کو ہی قرآنی مکافاتِ عمل سمجھ کر اپنی عقل کو مطمئن کر لیں تو ہم کبھی بھی قرآنی فکر سے استفادہ نہیں کر سکتے کیونکہ یہی تو دوسرے انسان ہیں جو قرآن میں ایمان نہیں رکھتے اور یہی سوچ کر اپنی زندگی گزار رہے ہوتے ہیں اور اس طرح غلط نظام صدیوں چلتا رہتا ہے اور اکثریت ناانصافی کا شکار ہوتی رہتی ہے۔

اپنی عقل کو انسانی مسائل کے حل کی طرف مائل کرنا اپنی سوچ کو بدلنے سے شروع ہوتا ہے۔ لیکن اگر ہم میں سے جو قوت رکھتے ہیں اور دولت بھی اگر سوچنا شروع کر دیں کہ یہ سب کچھ اللہ تعالیٰ کی رحمت سے آپ کو حاصل ہوا ہے اور جو ہم اکثر سنتے ہیں تو غلط نظام کبھی بھی تبدیل نہیں ہو سکتا۔ کیونکہ عقل نے غلط نظام کو ہی صحیح کر کے پیش کر دیا ہے اور اس کو ہم نے عقل کو آمادہ کر کے قبول بھی کر لیا ہے۔ ایسی صورت میں قرآنی آیات ہمارے سامنے آ بھی جائیں تو وہ کوئی اثر پیدا نہیں کریں گی جن سے ہم قرآن کی تعلیم کی طرف رجوع کریں۔ یہی وجہ ہے کہ مغرب میں

ہر قسم کے مذہبی انسان اپنی کامیابی کو God کی رحمت سے تعبیر کرتے ہیں۔ میں نے خود دیکھا ہے کہ عیسائی حضرات سمجھتے ہیں کہ مغرب کی مادی ترقی عیسائیت کی اور Jesus میں عقیدہ رکھنے کی مرہون منت ہے۔ مذہبی مسلمان بھی یہ کہہ کر کہ ہم پر اللہ کا بہت کرم ہے، تسلی سے زندگی گزارتے ہیں کہ ہم نے نماز پڑھ لی ہے ،روزے رکھ لئے ہیں اور حج بھی کرلیا ہے اور کچھ زکوٰۃ وغیرہ بھی دے دی ہے اور ہم قرآن کو بغیر سمجھے اللہ کی کتاب بھی مانتے ہیں۔ اس لئے جنت ہمیں مل جانی چاہئے کیونکہ ہم نے مذہب کے مطابق اللہ کو خوش کر دیا ہے۔

کیا قرآن کے مطابق ایسا ہے؟ کیا دین کے نظام کو سمجھے بغیر اور اس کے لئے کوشش کیے بغیر ہم اُس جنت کے حقدار ہو سکتے ہیں جس کا ذکر سورۃ توبہ کی آیت میں کیا ہے کہ اللہ نے مومنین سے اُن کی جان اور مال جنت کے عوض خرید لیا ہے (9:111) یہاں سے ہم اب اس سوال کی طرف آتے ہیں کہ ہم اپنی عقل کو کس طرح مثلاً کتاب کو پڑھنے پر آمادہ کر سکتے ہیں؟ یہ کتاب ہمیں کس طرح بہتر زندگی کی طرف آمادہ کرتی ہے؟ یہ کتاب کیوں ہدایت کا سرچشمہ ہے اور آخر اس کی ضرورت کیوں ہے؟

(1) انسانی عقل جب تک کسی مسئلہ کی طرف اپنی توجہ مبذول نہ کرے ہم اُس کا حل کبھی بھی نہیں سوچ سکتے۔ مثلاً ہم نے دیکھا ہوگا کہ کچھ لوگ اپنی خواہشات کی پیروی میں دوسرے انسانوں کے ساتھ زیادتی کرتے ہیں۔ ایسے لوگ قرآن کی زبان میں ظلم کرتے ہیں۔ یہ لوگ قرآن کی ہدایت کی طرف نہیں آسکتے۔ اُن کا اپنی زندگی کا رویہ اُن کے اور ہدایت کے درمیان دیوار بن کر حائل ہو جاتا ہے۔

(2) انسانی عقل تنہا ہر مسئلہ کا حل بھی نہیں سوچ سکتی۔ اس کو دوسرے انسانوں کی مدد درکار ہوتی ہے تاکہ وہ سب ملکر اجتماعی مسائل کا حل سوچیں اور اُن کو بروئے کار لائیں۔ اس لئے انسانوں کا مل جُل کر رہنا عقل کی ترقی کے لئے اہم ہے۔

(3) چونکہ انسان کے پاس اختیار اور ارادہ ہے اس لئے عقل اپنے فیصلے اور سوچ میں آزاد ہے۔ لیکن فیصلے کرنے کی صلاحیت کا استعمال معاشرہ کی اجتماعی حالت پر منحصر ہے۔ مثلاً جن معاشروں میں آزادی اظہار پر پابندی ہے وہاں انسان آزادی سے اپنی رائے کا اظہار نہیں کر سکے گا۔ جس کی وجہ سے ایسے معاشرہ میں Ideas ترقی نہیں پاسکیں گے۔ اس لئے تجزیہ کے لیے ہمیں اپنے معاشرہ کی اقدار کی روشنی میں دیکھنا ہوگا کہ کون سے معاشرہ اور کونسی اقدار سے انسانی عقل کو بہترین طریقہ سے بہترین ماحول مل سکتا ہے۔ جس میں انسان اپنی پوشیدہ قوتوں کو بہترین طریقہ سے بروئے کار لا سکے۔

(4) عام ضروریاتِ زندگی کے لئے انسان کو علم ہوتا ہے کہ جسمانی ضرورت کے لئے وہ بہت اہم ہیں۔ اس لئے انسانی عقل اُن کو حاصل کرنے کے لئے جدوجہد کرتی ہے۔ بلکہ اکثر انسان اپنی ضرورت سے زیادہ کے لئے کوشاں ہوتے ہیں کیونکہ عقل اُن کو بتاتی ہے کہ اپنے مستقبل کی بھی فکر کرو۔ اس کوشش میں اکثر انسان مکافاتِ عمل کو بھول جاتے ہیں یا پھر کو اس کا علم ہی نہیں ہوتا کہ کوئی ایسا قانون انسانی زندگی میں لاگو ہے۔ یہ ایک اہم مسئلہ ہے جس کی طرف توجہ کی بے حد ضرورت ہے۔

(5) عقل کے اس طریقہ کار کے لئے عملی زندگی سے مثالیں بہت ضروری ہیں۔ عقل انسانی تجرباتی طریق سے سیکھتی ہے۔ اس لئے کہا جاتا ہے کہ تاریخ اپنے آپ کو دہراتی ہے۔ کیونکہ انسان وقت کے ساتھ باتوں کو بھول بھی جاتا ہے۔ اس لئے معاشرہ میں ایسے انسانوں کی ضرورت رہتی ہے جو کہ معاشرہ میں بحیثیت Warner کے موجود ہوں۔ جو اپنے Path کو بھی سیدھا رکھیں اور باقی معاشرہ کے لئے باعث ہدایت ہوں۔ اس میں تعلیمی عمل مسلسل نہیں ہو۔ تو نئی پود پچھلی علمی سطح سے استفادہ نہیں کر سکے گی۔ کیونکہ ہمیں علم ہے کہ ہر انسانی بچہ Clean Slate کے ساتھ دُنیا

میں آتا ہے۔

(6) مستقل اقدار عقل کے لئے راستہ کی حدود مقرر کر دیتی ہیں جنہیں انسان سوچ سمجھ کر قبول کرتا ہے۔ جیسے کہ ڈاکٹر کے نسخہ پر اپنی اچھی صحت کے لئے عمل کرتا ہے اور جانتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا تو نقصان ہوگا۔ یہاں وہ ان اقدارِ پر عمل بیماری سے بچنے کے لئے کرتا ہے کیونکہ عقل کو علم ہو جاتا ہے کہ اگر ان اقدار سے باہر گئے تو معاشرہ کی وہ حالت ہو جائے گی جو کہ تاریخ میں موجود ہے۔ یا پھر اُس معاشرہ کی حالت ہے جو کہ ان اقدار کے باہر چل رہے ہیں۔ یہ ایک بہت اہم نقطہ ہے جس کا سمجھنا بہت ضروری ہے۔

(7) صرف اور صرف قرآنی رہنمائی میں انسانی ذات کا تصور مکمل طور پر موجود ہے اور جو کہ انسانی معاشرہ کا جزو لاینفک ہے۔ اسلامی معاشرہ کی پوری کی پوری توجہ اس نقطہ پر ہے کہ انسانی ذات کی ترقی کے لئے کیا اقدامات کیے جائیں۔ اس نظریہ کی رُو سے انسان اپنی خواہشات کو مستقل اقدار کی حدود کے اندر لا سکتا ہے۔ اس نظریہ کے بغیر انسان صرف جسمانی طور پر ہی زندگی گزار سکتا ہے۔ اُس میں انفرادی یا اجتماعی طور پر ذات کی ترقی کا تصور مکمل طور پر سامنے نہیں آ سکتا۔

(8) اپنے اندر اس صلاحیت کو پیدا کرنا کہ عقل کو مستقل اقدار کے اندر اپنی خوشی سے زندگی گزارنی ہے ایک بہت مشکل کام ہے لیکن انسانی معاشرہ میں ہر کام کے لئے انسان کو محنت کرنی پڑتی ہے۔ صرف نقطہ نظر کو تبدیل کرنے کی ضرورت ہے جو کہ شروع میں رضا کارانہ ہے لیکن جب نظام بن جائے تو بچوں کو تعلیم کے ذریعہ یہ کام شروع ہو جاتا ہے اور اپنی خوشی سے وہ اس تعلیم و تربیت میں اپنا رول ادا کرتے ہیں۔

(9) چونکہ انسانی خواہشات ہر وقت ابھرتی ہیں۔ اس لئے ان کے لئے افراد معاشرہ کو تربیت کی ضرورت ہوتی ہے۔ یہ ایک اہم چیلنج ہے۔ جس کا تفصیلی جائزہ لینا بہت ضروری ہے۔ انفرادی طور پر انسان کو اپنی موجودہ حالت کا علم ہونا چاہئے۔ کہ اُس کی کیا State ہے۔ اس میں بھی قرآن اور ماڈرن Psychology مدد کرتی ہے۔

آپ نے اس سے اندازہ لگا لیا ہوگا کہ انسانی عقل ایک بہت اہم Trait ہے۔ جس کی تعلیم و تربیت پر ہی پورے معاشرہ کی خوشحالی کا راز ہے اور قرآن اسی سے Deal کرتا ہے۔ اگر عقل کسی کام پر مطمئن نہ ہو کہ یہ کام یا بات اُس کے فائدے میں ہے تو انسان بھی کبھی اُس کام پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اگر ہوگا بھی تو اس سے پورا فائدہ نہیں اُٹھا سکے گا۔ مثلاً ہم نے دیکھا ہے کہ انسانوں کی اکثریت موت کی اہمیت کو چوں کہ نہیں سمجھتے اس لئے موت کی حقیقت کو سمجھنے کے لئے کوشش نہیں کرتے اور اس کی موجودگی اور اہمیت سے انکار کرتے ہیں۔ اس انکار کا ہی نتیجہ ہے کہ انسان (یا اُس کی عقل) سمجھتا ہے کہ موت سے اُس کی زندگی ختم ہو جاتی ہے۔ اس لئے وہ بہت کم کوشش کرتا ہے کہ زندگی کے اعلیٰ مقاصد پر غور کرے اور اپنی ذات کو سمجھنے کی کوشش کرے۔ قرآن نے موت کی اہمیت کو بار بار اُجاگر کیا اور انسان کی جسمانی زندگی کی عارضیت کی طرف توجہ دلائی ہے۔ عقل کو موت کی اہمیت سے آگاہ کرنا جس میں آخرت کی اہمیت شامل ہے، بہت ضروری ہے اور ظاہر ہے کہ اس کے لئے کافی غور و خوض کی ضرورت ہے۔ جس میں انسان کی اندر کی سوچ باہر کی زندگی اور قرآنی تعلیم تینوں کو یکجا کرنا پڑتا ہے۔

آخر میں پھر ایک دفعہ اس بات کو ذہن میں رکھنا ضروری ہے کہ اگر انسانی عقل کسی کام کی افادیت پر رضامند نہیں ہے تو وہ اُس کام یا فائدہ کے حصول کے لئے پوری کوشش نہیں کرے گی۔ اس لئے قرآن کی افادیت کو اُجاگر کرنا مومنین کی ذمہ داری ہے اور یہ اُس وقت ممکن ہے جب ہم خود بھی پوری طرح اس وحی اللہ سے پوری طرح Convinced ہو کہ صرف یہی انسانی مسائل کا حل دے سکتی ہے اور اس میں مکافات عمل پر ایمان اور آخرت پر ایمان عقل کی پوری رضامندی سے ہی ممکن ہے۔

پمفلٹس --- PAMPHLETS

ادارہ طلوع اسلام دینی موضوعات پر پمفلٹس شائع کرتا رہتا ہے

فی پمفلٹ قیمت 10 روپے علاوہ ڈاک خرچ

اسلام آگے کیوں نہ چلا	قرآن مجید کے خلاف گہری سازش	دوقومی نظریہ
اسلام کیا ہے؟	قربانی	عورت قرآن کے آئینے میں
اسلام ہی کیوں سچا دین ہے؟	قیامت موجود	پاکستان کی نئی ''زیارت گاہیں''
اسلام اور مذہبی رواداری	قوموں کی تعمیر فکر سے ہوتی ہے ہنگاموں سے نہیں!	کیا تمام مذاہب یکساں ہیں؟
کیا اسلام ایک چلا ہوا کارتوس ہے؟	قوموں کے تمدن پر جنسیات کا اثر	تحقیق ربوٰ (مسئلہ سود)
اسلامی قانون کی اصل و بنیاد کیا ہے؟ (مغربی پاکستان ہائیکورٹ کا فیصلہ)	ہماری نمازیں اور روزے بے نتیجہ کیوں ہیں؟	کیا قائداعظمؒ پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟
اسلامی آئیڈیالوجی	ہندو کیا ہے؟	بنیادی حقوق انسانیت اور قرآن
اسلام اور پاکستان کے خلاف گہری سازش (20 روپے علاوہ ڈاک خرچ)	ہیں کواکب کچھ نظر آتے ہیں کچھ (قرآنی اصطلاحات کی تشریح)	تکذیب دین کون کرتا ہے اور مصلّی کسے کہتے ہیں
اسلامی مملکت کے سربراہ کی معاشی ذمہ داریاں	ہماری تاریخ میں کیا ہے؟	روٹی کا مسئلہ
اسلامی قانون سازی کا فریضہ (بال سے باریک تلوار سے تیز)	ہم میں کیریکٹر کیوں نہیں؟	جو ہو ذوق یقین پیدا تو کٹ جاتی ہیں زنجیریں
انسانیت کا آخری سہارا	ہم عید کیوں مناتے ہیں؟	نماز کی اہمیت
اے کشتۂ سلطانی و ملائی و پیری	مقام اقبالؒ	ضبطِ ولادت (خاندانی منصوبہ بندی)
اقبال کا مردِ مومن	مقام محمدی صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم	علماء کون ہیں؟
اندھے کی لکڑی	مرزائیت اور طلوع اسلام	فرقے کیسے مٹ سکتے ہیں
آرٹ اور اسلام	ماؤزے تنگ اور قرآن	کافرگری
قرآن کا معاشی نظام	مومن کی زندگی	حرام کی کمائی
قرآن کا سیاسی نظام	جہاں مارکس ناکام رہ گیا	عالمگیر افسانے

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

بچوں کا صفحہ

تم بہت بہادر ہو

ارشد صاحب ایک سکول میں پڑھاتے تھے۔ وہ سچ مچ ایک استاد تھے۔ بہت سے پڑھانے والے تو ایسے ہوتے ہیں کہ بس کلاس میں سبق دے دیا اور پھر لڑکوں سے ان کا کوئی تعلق نہیں رہتا۔ ارشد صاحب ایسے نہ تھے۔ وہ اپنے شاگردوں کو اچھی طرح سمجھنے اور جاننے کی کوشش کرتے تھے۔ ظفر کو تقریر کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے اس کی ہمت بڑھائی اور اسے بتایا کہ تقریر کیسے کی جاتی ہے۔ مزمل کو تصویریں بنانے سے دلچسپی تھی، ارشد صاحب اس کے لیے تصویریں بنانے کی کئی کتابیں لائے۔ سلیم کو شعر یاد کرنے کا شوق تھا، ارشد صاحب نے ایک کاپی پر اسے بہت اچھے اچھے شعر لکھ کر دیے۔ ایسے شعر جن سے آدمی کو اچھے اچھے سبق حاصل ہوں۔

تم تو جانتے ہی ہو کہ ہر سکول میں اچھے لڑکے بھی ہوتے ہیں اور بُرے لڑکے بھی۔ بہت سے استاد بُرے لڑکوں سے نفرت کرتے تھے۔ ہمیشہ ان کی بُرائی کرتے تھے۔ مگر ارشد صاحب ایسے لڑکوں سے بھی پیار کرتے تھے۔ وہ کسی سے نفرت کرنا تو جانتے ہی نہ تھے۔ اپنے ساتھیوں سے وہ اکثر کہتے تھے کہ تعلیم کا مقصد ہی یہ ہے کہ بُروں کو اچھا بنایا جائے۔ یہ کام بڑی محنت چاہتا ہے اور مدتوں بعد اس محنت کا پھل ملتا ہے۔

چھٹی جماعت میں ایک لڑکا تھا۔ اس کا نام فیروز تھا۔ وہ ہمیشہ سب سے بدتمیزی کرتا۔ نرمی سے بات کرنا تو جانتا ہی نہ تھا۔ ایک دن اپنی کلاس کے کسی لڑکے سے سڑک پر اس کی لڑائی ہوگئی۔ فیروز کہنے لگا:

''تم احمق ہو۔ جاہل ہو۔ تمہارے گھر والے بھی ایسے ہی ہیں۔''

اتفاق سے یہ باتیں ارشد صاحب نے بھی سن لیں۔ دوسرے دن جب وہ چھٹی جماعت میں پڑھانے آئے تو سبق شروع کرنے سے پہلے انہوں نے لڑکوں سے کہا:

''کل تمہارے ایک بھائی نے دوسرے بھائی کو جاہل اور احمق کہا۔ یہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کو بھی بُرا بھلا کہا۔ تم سب ایک دوسرے کے بھائی ہو اگر تم دوسروں کی بے عزتی کرتے ہو تو اپنی ہی بے عزتی کرتے ہو۔''

''تعلیم اور شرافت کی ایک پہچان آدمی کی بات چیت ہوتی ہے۔ ادھر تم نے زبان کھولی اور ادھر پتہ چل گیا کہ تم کیسے انسان ہو۔ اللہ تعالیٰ نے اپنی کتاب قرآن شریف میں ہمیں حکم دیا ہے کہ ہمیشہ ایسی زبان بولو جو شریفوں کی زبان مانی جاتی ہو۔''

''قرآن شریف نے ہمیں گفتگو اور بول چال کے بارے میں اچھی اچھی باتیں بتائی ہیں۔ ہمیشہ صاف، سچی اور سیدھی بات کرو، جھوٹی باتوں سے ہمیشہ بچو۔ ہمیشہ اچھی اچھی باتیں کرو۔ جب بھی بات کرو انصاف کی بات کرو۔''

اور ہاں! بعض بچے اونچی آواز میں چیخ چیخ کر، چلا چلا کر باتیں کرتے ہیں۔ اس طریقہ کو آج پوری دنیا میں کہیں بھی اچھا نہیں سمجھا جاتا۔ گنوار اور جاہل لوگ چیخ کر باتیں کرتے ہیں۔ بہت پہلے قرآن شریف نے انسانوں کو بتایا تھا کہ اپنی آواز کو نیچا رکھو۔ سب سے بُری آواز گدھے کی ہوتی ہے۔''

''اچھا میرے بیٹو! یہ تو ہوگئیں کچھ کام کی باتیں۔ اب اپنا سبق شروع کرو۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر پڑھانا شروع ہی کیا تھا کہ فیروز اُٹھ کر کھڑا ہوگیا۔ اس نے کہا:

''جناب! مجھے کچھ کہنے کی اجازت دیجئے۔''

ارشد صاحب نے مسکرا کر کہا: ''ضرور ضرور۔۔۔ کیا کہنا چاہتے ہو۔''

فیروز نے کہا: ''جناب! آپ نے آج جو کچھ کہا ہے میرے دل میں ایک ایک بات اتر گئی ہے۔ آپ نے مجھے شرمندگی سے بچانے کے لیے میرا نام نہیں لیا۔ کل میں نے ہی ارشاد کو برا بھلا کہا تھا۔ میں اپنے بھائی ارشاد سے آپ سب کے سامنے معافی مانگتا ہوں۔ انشاء اللہ اب میری کسی بات سے میرے کسی بھائی کو دکھ نہ پہنچے گا۔''

یہ کہتے ہوئے فیروز کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

ارشد صاحب نے آگے بڑھ کر فیروز کو گلے سے لگا لیا اور اس سے کہا: ''فیروز! تم بہت بہادر ہو۔۔۔ اپنی غلطی مان لینا سب سے بڑی بہادری ہے۔''

❁❁❁❁

کوئی دعویٰ نہیں

کسی قسم کا کوئی دعویٰ نہیں۔ میں نے قرآن کریم کو اپنی بصیرت کے مطابق سمجھنے کی کوشش کی ہے اور اسی فکر پر اس تحریک کی بنیاد رکھی ہے میری یہ فکر میری تحریروں میں محفوظ ہے اور انہی تحریروں کا میں ذمہ دار ہوں۔ اگر کوئی شخص کوئی ایسی بات میری طرف منسوب کرے جو میری تحریروں میں نہیں، تو اس بات کو نہ کوئی سند حاصل ہوسکتی ہے نہ میں اس کا ذمہ دار ٹھہرایا جاسکتا ہوں، خواہ وہ شخص مجھ سے کتنا ہی قریب کیوں نہ ہو۔ میں نے اس وارننگ کو اس لیے ضروری سمجھا ہے کہ میں دیکھ رہا ہوں کہ یہ سلسلہ ابھی سے شروع ہوگیا ہے۔ اس زمرہ میں وہ لوگ بھی شامل ہیں جو باتیں تو اپنی طرف سے کرتے ہیں، اور منسوب کردیتے ہیں انہیں تحریکِ طلوع اسلام کی طرف، وہ دانستہ ایسا کرتے ہوں یا نادانستہ، دونوں صورتوں میں اس سے تحریک کو بڑا نقصان پہنچتا ہے۔ تحریک کے لیے سند صرف وہ تحریریں ہیں جو اس کی طرف سے شائع ہوئی ہیں، نہ کہ زبانی روایات خواہ راوی کتنے ہی ثقہ کیوں نہ ہوں میری درخواست ہے کہ آپ احباب اس کا بھی خاص طور پر خیال رکھیں۔

(پرویزؒ، سالانہ کنونشن، 17 تا 20 مارچ 1966ء)

محمد علی صابر صدیقی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

نشست نمبر 2

نوجوانوں کا صفحہ

نخلِ سینا

دوپہر کا وقت ہونے کو ہے کلیم الزمان معمول کے خلاف کھانے کے وقت سے پہلے کمرے میں آ بیٹھے ہیں وہ عالم آرا کو آواز دیتے ہیں۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی! آج کھانے میں کیا ملے گا۔ خوشبو تو بہت اچھی خبر دے رہی ہے۔ عالم آرا کلیم صاحب کے پاس آ کر کہتی ہے۔ ابو! پلاؤ پکا رہی ہوں، لیکن آج مجھ سے ایک غلطی ہوگئی ہے کہ مرغی کے قورمہ میں غلطی سے مرچیں زیادہ پڑ گئی ہیں اور شکیل صاحب کا مزاج پہلے ہی مرچیلا ہے۔ وہ زیادہ مرچیں پسند نہیں کرتے۔

کلیم الزمان: بیٹی! گھبرانے کی کوئی بات نہیں یوں کرو کہ پیاز کی ایک گٹھنی لو اسے گھی میں بھوننے کے بعد مسل کر ہنڈیا میں ڈال کر اوپر ایک لیموں نچوڑ دو۔ قورمہ کا مرچیلا پن ختم ہوجائیگا۔ اللہ تعالیٰ کا قانون باورچی خانہ میں بھی استعمال کیا جاسکتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! وہ کونسا قانون ہے؟

کلیم الزمان: بیٹی! قرآن مجید میں ایک تیر بہ ہدف نسخہ ہے جو ہر گنہگار استعمال کرسکتا ہے۔ اور وہ نسخہ تم سامنے دیوار پر دیکھ لو۔ دیوار پر ایک فریم میں لکھا ہوا ایک کتبہ آویزاں تھا اور اس قسم کے کتبے کلیم الزمان صاحب کے ہر کمرے میں لٹکے ہوئے تھے۔ انہیں ان کے ماضی کی یاد دلا رہے تھے اور لاشعور کے تہہ خانے سے کچھ یادیں اُبھر اُبھر کر انہیں سانپ کی طرح ڈس رہی تھیں۔ مگر کلیم صاحب ہر وقت ہر گھڑی ان اذیت ناک خیالات سے چھٹکارا پانے کی تگ و دو میں رہتے تھے۔ کتبہ میں لکھا تھا۔

اِنَّ الْحَسَنٰتِ یُذْهِبْنَ السَّیِّاٰتِ ؕ (11:114)

کلیم الزمان کسی سوچ میں گم ہوگئے مگر عالم آرا کی آواز نے انہیں چونکا دیا۔ عالم آرا کے سوال کرنے پر کلیم صاحب نے کہا کہ میں نے صرف تمثیلاً یہ نسخہ بتایا ہے قورمہ میں مرچوں کا زیادہ ہونا غلطی تھی گناہ تھا لیکن پیاز اور لیموں میں جو نیکی یا خوبی موجود تھی اس نے مرچوں کا مرچیلا پن کم کردیا اور اللہ تعالیٰ کا یہ قانون پوری شدت سے ہر جگہ نافذ ہے اور یہی کیا معاشرے کا ہر قانون اخلاقی ہو یا معاشرتی، سیاسی ہو یا معیشت سے تعلق رکھتا ہو وہ قوانین فطرت کی طرح اٹل ہے۔ اگر غلطی کا برائی کا جرم کا، گناہ کا ازالہ وقت پر نہ کیا جائے تو دنیا اور آخرت کے عذاب سے بچا نہیں جاسکتا اور اگر اس قانون پر پورا پورا یقین ہوجائے تو غالب کے اس شعر کو سمجھنے میں کوئی دقت نہیں رہتی کہ ؎

اک ایک قطرے کا مجھے دینا پڑا حساب　　خونِ جگر ودیعتِ مژگانِ یار تھا

عالم آرا: ابو! کمال کردیا ہے آپ نے مجھے غالب کے اس شعر کی آج سمجھ آئی ہے بات پلاؤ کی خوشبو سے چلی تھی اور غالب پر آ ٹھہری ہے۔ میری چھٹی حس یہ کہہ رہی ہے کہ، کچھ تو ہے جس کی پردہ داری ہے۔

کلیم الزمان (سربراہ): بیٹی! پردہ داری کی کوئی بات نہیں۔ پلاؤ کی خوشبو ہے جو میرے خیالات میں تلاطم پیدا کر رہی ہے۔ تم پوچھو گی کیسے؟ تو سنو۔ روایت ہے "دروغ برگردن راوی" کہ لاہور سے ایک رسالہ نکلتا تھا۔ جس کا ایڈیٹر انگریز تھا اور مجلہ بھی انگریزی زبان ہی میں شائع ہوتا تھا۔ یکا یک خبر آئی کہ فلاں انگریزی رسالہ کا ایڈیٹر مسلمان ہو گیا ہے۔ یہ زمانہ وہ تھا جسے علامہ اقبال کا زمانہ کہنا چاہیے۔ علامہ کی طبیعت میں تجسس بہت تھا۔ مذکورہ ایڈیٹر سے ملاقات کے دوران علامہ نے اس نو مسلم سے پوچھا کہ اس نے اسلام اور اسلامی تعلیمات کا مطالعہ تو کیا ہوگا۔ ایڈیٹر صاحب نے کہا کہ وہ تو اسلام کے متعلق کچھ نہیں جانتا۔ علامہ کی متجسس نگاہوں کو دیکھ کر اس نے کہا کہ وہ تو پلاؤ کھا کر مسلمان ہو گیا ہے۔ یہ سوچ کر کہ جس قوم کا کھانے کا مذاق اتنا لطیف ہے اس کا خدا کا تصور کس قدر لطیف ہوگا اور تم تو جانتی ہو کہ مسلمان گھرانوں میں پلاؤ مرنے کے بعد تک بھی پیچھا نہیں چھوڑتا۔ اکبر الہ آبادی نے خوب کہا تھا کہ ؎

تمہیں بتائیں کہ مرنے کے بعد کیا ہوگا پلاؤ کھائیں گے احباب فاتحہ ہوگا

اور اس واقعہ کے برعکس شاید یہ برطانوی فلسفی کا قول ہے کہ تم مجھے یہ بتا دو کہ فلاں قوم نے کس قسم کا خدا پرستش کے لئے تجویز کر رکھا ہے تو میں اس قوم کی تہذیب و تمدن کا پورا خاکہ پیش کر دونگا۔ بیٹی! دیکھا کہ خدا تعالیٰ کے تصور سے انسان کی زندگی کا کیا تعلق ہے۔ ''لن ترانی'' کا شعلہ ہمیشہ نخل سینا پر ہی گرتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! اگر انسان ''رب ارنی'' کہے اور اسے ٹکا سا جواب مل جائے تو لن ترانی سننے کے بعد تو اسے چپ کر کے بیٹھ جانا چاہیے۔

کلیم الزمان: بیٹی! خدا تعالیٰ کو دیکھنا ضروری نہیں اور نہ ہی اسے طبیعی آنکھ دیکھ سکتی ہے۔ اُسے پہچاننا ضروری ہے اور وہ قرآن مجید میں موجود اسمائے حسنہ کی مدد سے پہچانا جا سکتا ہے اور ہر شخص اپنے ظرف کے مطابق اس کا تصور بھی قائم کر سکتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! یہ سب کچھ درست ہے جو آپ نے فرمایا لیکن اللہ تعالیٰ کے اسمائے حسنہ سے ہمارا کیا تعلق ہے۔ وہ ایسی ہستی ہے جس نے کائنات کو وجود بخشا۔ ساری کائنات ہمارے سمیت اس کی مخلوق ہے اور اسی کی عبادت کرتی ہے اور بس قصہ ختم۔

کلیم الزمان: بیٹی! حضور نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ اپنے اندر خدا تعالیٰ کے سے اخلاق پیدا کرو۔ یعنی اسمائے حسنہ ہمارے لئے ماڈل کی حیثیت رکھتے ہیں۔ وہ رحیم ہے تو تم بھی ایک دوسرے کے لئے رحمت بن جاؤ۔ وہ کریم ہے، تم میں بھی یہ صفت بہ حد بشریت پیدا ہو جانی چاہیے۔ وہ تواب ہے، بندوں کے چھوٹے موٹے قصور قانون کے مطابق معاف کر دیتا ہے۔ تم بھی ایسا اخلاق پیدا کرو۔ اکبر الہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے ؎

موسیٰ نے کی عرض کہ اے بار الہ مقبول ترا کون ہے بندوں میں سوا
فرمایا کہ بندہ ہمارا وہ ہے جو لے سکے اور نہ لے بدی کا بدلہ

اور سنو بیٹی! اللہ تعالیٰ کی سب سے بڑی صفت اس کی خالقیت ہے وہ ساری کائنات کا خالق ہے اور اسکی تخلیق کا عمل ہر لمحہ، ہر گھڑی جاری رہتا ہے اور اسی کی وجہ سے کائنات میں ارتقاء کا عمل جاری ہے۔ علامہ اقبال فرماتے ہیں کہ تم بھی عمل ارتقا میں خدا کے معاون بن جاؤ۔ چنانچہ فرمایا ؎

تراش از تیشۂ خود جادۂ خویش براہِ دیگراں رفتن عذاب است

گر از دستِ تو کارے نادر آید! گنا ہے ہم اگر باشد، ثواب است

مفہوم: اپنے ہی تیشہ سے اپنا راستہ بنایئے۔ دوسروں کے، بنے بنائے، راستے پر چلنا عذاب ہے۔ اگر آپ کے ہاتھ سے کوئی نادر اور انوکھا کام سرانجام پائے، اگر وہ کام گناہ کے زمرہ میں آتا ہو پھر بھی اپنی ندرت اور انفرادیت کے باعث ثواب کا مستحق ہوگا۔ (س۔ا)

ایک اور جگہ فرمایا ہے ؎

ہر کہ او را قوت تخلیق نیست نزد ما جز کافر و زندیق نیست

مفہوم: جس کسی کے پاس (کچھ نیا) تخلیق کرنے کی صلاحیت اور قوت نہیں ہے۔ ہمارے نزدیک وہ کافر اور زندیق ہے۔ (م۔س۔ا)

اور اس عمل تخلیق میں ندرت ہونی چاہیے۔ سورۃ اخلاص میں پہلی آیت ہے۔ قل ھواللہ احد جانتی ہو اس کا کیا مطلب ہے؟

عالم آرا (بہو): جانتی ہوں ابو اتنی سی عربی تو آتی ہی ہے۔ اس کا مطلب صاف ہے مطلب ہے اللہ ایک ہے۔

کلیم الزمان: نہیں بیٹی! اس آیت کا مطلب ہے کہ اللہ تعالیٰ یونیق (Unique) ہے۔ لہذا تم جو کام بھی کرو اس میں انفرادیت ہونی چاہیے۔ یہ جو تم ہر روز آلو گوشت کھلا دیتی ہو (ہنستے ہوئے) قدرت کا عمل باورچی خانے میں بھی جاری رہنا چاہیے۔ اور ٹی وی چینل پر "مسالحہ" پروگرام دیکھ کر نہیں بلکہ تمہارا رویہ یہ ہونا چاہیے کہ ؎

ہم نے جو طرز فغاں کی ہے قفس میں ایجاد اب وہی اہل چمن کی بھی زباں ٹھہری ہے

سورۃ اخلاص کی دوسری آیت ہے۔ اللہ الصمد۔ اس کا مطلب آسان زبان میں یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات خود بخود قائم ہے اسے کسی سہارے کی ضرورت نہیں بلکہ وہ تو دوسروں کا سہارا ہے۔ یعنی اگر انسان دوسروں کے سہارے زندگی گزارے تو شخصیت میں اضمحلال آجاتا ہے۔ اسلئے انسان کی کوشش ہونی چاہیے کہ زندگی گزارنے کے لئے دوسروں کا سہارا نہ ڈھونڈھے۔ اگر کسی قوم کے افراد کو سہارے ڈھونڈنے کی عادت پڑ جائے تو اس پر گداگری کا ٹھپہ لگ جاتا ہے اور یہ حقیقت اظہر من الشمس ہے۔ ذوق مرحوم نے اس خیال کو اپنے شعر میں اجاگر کرتے ہوئے فرمایا ہے ؎

نہ پکڑیں دامنِ الیاس گرداب بلا میں ہم کہ بدتر ڈوب کر مرنے سے ہے جینا سہارے کا

سورۃ اخلاص کی تیسری آیت ہے۔ لَمْ يَلِدْ ۙ وَلَمْ يُوْلَدْ ۝ (112:3) اس آیت کا سیدھا سادھا مطلب یہ ہے کہ خدا نہ کسی کی اولاد ہے اور نہ ہی کوئی اس کی اولاد، اور پھر اس کا مطلب یہ نکلتا ہے کہ اس کا جذباتی طور پر کسی کی طرف جھکاؤ نہیں۔ وہ اپنی ساری مخلوق کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ یہ ایک آنکھ میں محاورے کے طور پر استعمال کر رہا ہوں۔ یہاں مجھے ایک لطیفہ یاد آ گیا۔ ہمارے ساتھ ایک لڑکا پڑھا کرتا تھا۔ اس کا نام افضل حیات تھا۔ اس کے والد جوانی میں ہاکی کے کھلاڑی تھے۔ کسی حادثے میں ان کی ایک آنکھ ضائع ہوگئی چونکہ ہاکی کھیلنے کا بے حد شوق تھا۔ اسلئے عمر ڈھلنے کے بعد وہ ہاکی کے میچوں میں ریفری کا کام سرانجام دیتے تھے۔ افضل حیات مزاحاً کہا کرتا تھا کہ میرا باپ بہت دیانتدار ہے ہاکی کے میچوں میں وہ دونوں ٹیموں کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ ہوسکتا ہے کہ مذکورہ ریفری کبھی کبھار زرد یا سرخ کارڈ دکھانا بھول جاتا ہو لیکن خدا تعالیٰ سے کبھی بھول چوک نہیں ہوتی۔ انسان کے ہر عمل کا نتیجہ برآمد ہو کر رہتا ہے۔ فٹ بال کے کھیل میں گول کیپر کو یہ استثناء حاصل ہوتی ہے کہ وہ

گیند کو ہاتھ سے پکڑ سکتا ہے۔ لیکن انسانی معاشرے میں جو کھیل کھیلا جاتا ہے۔ اس میں کسی کو بھی استثناء حاصل نہیں ہوتی کیونکہ اللہ تعالیٰ کا وہ فرشتہ جو انسانی معاشرے کی دیکھ بھال پر مامور ہے اور تعارف کے لئے جس کا میں نے اجماعیل القاہر نام رکھا ہے کسی کو نہیں بخشتا۔ یہ ریفری بھی ہر انسان کو ایک آنکھ سے دیکھتا ہے۔ اگر خدا تعالیٰ کے قانون کی خلاف ورزی ہو رہی ہو خواہ غرباء کی جھونپڑیوں میں ہو یا امراء کے محلات میں، تو اس ریفری کے ریڈ کارڈ کی جھلک وہاں بھی پہنچ جاتی ہے۔ لیکن ہماری قوم کی شپرہ چشمی کی یہ حالت ہے کہ خدا تعالیٰ کے احکام کو بنی نوع انسان تک پہنچانے والی ہستی یعنی حضور نبی اکرم ﷺ تو یہ کہتے ہیں کہ اگر قانون الہیٰ کی خلاف ورزی کروں تو میں بھی خدا تعالیٰ کے عذاب سے ڈرتا ہوں یعنی ایک عام آدمی ہو یا خدا کا رسول ہو کسی کو بھی استثناء حاصل نہیں لیکن ہمارا دستور کہتا ہے کہ صدر مملکت کو کھلی چھٹی ہے کہ جو چاہیں کریں انہیں کوئی پوچھ نہیں سکتا۔ لیکن ہمارے ہاں تو خدا تعالیٰ کا تصور ایک منفرد تصور ہے جو تمہیں دنیا کے کسی مذہب کسی دین کسی فلسفہ میں نہیں ملتا اور یہ کہ ہمارے ہاں خدا تعالیٰ کو بھی استثناء حاصل نہیں۔

عالم آرا (بہو): ابو یہ آپ نے کیا کہہ دیا۔ اللہ تعالیٰ تو جو چاہے کر سکتا ہے۔

کلیم الزمان: بیٹی! تم ٹھیک کہتی ہو۔ اللہ تعالیٰ جو چاہے کر سکتا ہے اور کرتا ہے لیکن اگر اس نے کوئی قانون بنا دیا ہے تو وہ خود بھی اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور اگر کسی کو بھی شکایت ہو تو وہ اس سے پوچھ سکتا ہے۔ اس نے خود سورۃ فرقان میں فرمایا ہے كَانَ عَلٰى رَبِّكَ وَعْدًا مَّسْـُٔوْلًا ﴿۱۶﴾ (25:16) تم اس سے پوچھ سکتے ہو کہ اللہ میاں! میں نے غریبوں کے لئے دس دیگیں پکوائی تھیں۔ ان میں پلاؤ بھی تھا، زردہ اور متنجن بھی، روسٹ بھی تھا اور بریانی بھی، پھر بھی میری مراد کیوں پوری نہیں ہوئی۔ میں کیوں الیکشن جیت نہ سکا۔ اس جواب میں اللہ تعالیٰ تمہیں بتائے گا کہ تمہاری مراد اسلئے پوری نہیں ہوئی کہ تم نے یہ سب کچھ غریبوں کے لئے نہیں کیا تھا۔ اپنے ووٹروں کیلئے رشوت تھی۔

دیکھا بیٹی! ہمارے ہاں اللہ کا کیا تصور ہے اور وہ کہتا ہے کہ اس کے متعلق تم جو تصور بھی قائم کر لو وہ اس سے بلند ہے۔ اس کی ذات انسان کے قیاس و وہم سے بالاتر ہے۔ اس کا تصور انسان کو حیرت زدہ کر دیتا ہے اور انسان مایوسیوں اور زندگی کی مشکلات میں اسی کی طرف رجوع کرتا ہے۔ الغرض بنی نوع انسان کی آخری پناہ گاہ اللہ تعالیٰ ہی کی ذات ہے اور وہ سورۃ اخلاص کی چوتھی آیت کا مطلب یہی ہے کہ اللہ تعالیٰ کی ذات بے مثل ہے۔ اسے کسی چیز سے تشبیہ نہیں دی جا سکتی وَلَمْ يَكُنْ لَّهٗ كُفُوًا اَحَدٌ ﴿۴﴾ (112:4) اس آیت میں بھی اللہ تعالیٰ کی انفرادیت کا پہلو جھلکتا ہے۔

عالم آرا (بہو): ابو! سکولوں اور کالجوں اور مدرسوں میں تو قرآن مجید اس طرح نہیں پڑھایا جاتا وہاں تو بس قرآت پر زور دیا جاتا ہے۔ تلفظ ٹھیک کیا جاتا اور الفاظ کے معنی سمجھائے جاتے ہیں، یعنی لوگ جسے ترجمہ کہتے ہیں۔

کلیم الزمان: بیٹی! قرآن مجید صرف پڑھنے کے لئے نہیں ہے۔ اس کو پڑھ کر سمجھنا اور سمجھ کر اس پر عمل کرنا مقصود ہے۔ لیکن ہم نے اس معاملے میں نہایت غفلت شعاری کا مظاہرہ کیا ہے۔ قرآن مجید کے ایک ایک لفظ میں معنویت کی دنیائیں آباد ہیں۔ صرف چشم بینا کی ضرورت ہے۔ اس وقت تو باورچی خانہ تمہارا انتظار کر رہا ہوگا۔ کسی وقت تمہیں سمجھاؤں گا کہ علامہ اقبال نے یہ کیوں کہا تھا کہ ؎

ایں کتابے نیست چیزے دیگر است

خواجہ ازہر عباس، فاضل درس نظامی
www.azharabbas.com
khawaja.azharabbas@gmail.com

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

انسان کی تخلیق کا مقصد اس زمین پر اللہ کی حاکمیت قائم کرنا ہے

معروف انگریزی روزنامہ ''ڈان'' کی 2 ستمبر کی اشاعت میں جناب پروفیسر پرویز ہود بھائی کا ایک مضمون Holy men___ theirs and ours شائع ہوا ہے اس مضمون کا Sub Title جو اس مضمون کے مطلب کو Sum-up کر دیتا ہے اس طرح تحریر ہے Religion in politics produces a highly toxic, explosive mix. جس کا مفہوم یہ ہے کہ اگر سیاست میں مذہب کو شامل کر دیا جائے تو وہ ایک زہریلا پھٹنے والا مواد بن جاتا ہے۔ محترم جناب پروفیسر پرویز ہود بھائی صاحب دنیا کے معروف سائنسدانوں میں شمار ہوتے ہیں۔ وہ ایک سائنسدان ہونے کے علاوہ مشہور سکالر اور دانشور بھی ہیں اور پاکستان سے محبت کرتے ہیں۔ ہم بھی کافی عرصہ سے ان کے نیاز مند ہیں اسی لئے ان کی ذاتی خوبیوں سے آگاہ و واقف ہیں۔

آج کل بھارت میں رام رحیم سنگھ کا عام چرچا ہو رہا ہے۔ بظاہر یہ شخص ایک مذہبی آدمی ہے۔ اس کے پیروکار بڑی تعداد میں ہیں اور اس کو ایک مقدس آدمی سمجھتے ہیں لیکن اب اس کی کرتوت اور کارنامے منظر عام پر آ گئے ہیں اور اس کو اس کی کرتوتوں کی سزا کے طور پر عدالت نے 20 سال قید کی سزا سنادی ہے۔ بھارت کے مقدس شخص کے ذکر کے بعد پروفیسر صاحب نے پاکستان کے مقدس لوگوں کا تذکرہ کیا ہے اور ان کی خامیاں شمار کرائی ہیں اور مضمون کو اس پیراگراف پر ختم کیا ہے کہ مذہب اور سیاست کو ملانے سے حالات مزید بدتر ہو سکتے ہیں اور عوام مذہبی مقدس لوگوں کی اندھی تقلید کرنے لگ جاتے ہیں۔ اس لئے بہتر ہے کہ مذہب اور سیاست کو الگ الگ رکھا جائے۔

ہم محترم پروفیسر صاحب کے ان خیالات سے صد فیصد اتفاق رکھتے ہیں اور مذہب کو سیاست کے ذریعے Exploit کرنے کی حمایت نہیں کرتے۔ لیکن بھارت اور یورپ کی اس طرح کی مثالوں کو پیش کر کے ہمارے دانشور حضرات یہ نتیجہ برآمد اور اخذ کرتے ہیں کہ قرآن کریم کا پیش کردہ نظام بھی اسی طرح کا ہے اس کو جاری کرنے کے بھی یہی نتائج برآمد ہوں گے۔

جہاں تک یورپ کی اقوام اور بھارت کا تعلق ہے ان کے مذاہب میں سٹیٹ کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کی کسی مذہبی کتاب میں کوئی قانون درج نہیں ہے۔ ان سب مذہبی کتابوں میں صرف وعظ و تلقین اور قصے، کہانیاں درج ہیں، جن سے وہ اخلاقی درس حاصل کر لیتے ہیں۔ البتہ بائبل میں صرف ایک قانون طلاق کے متعلق درج ہے۔ ان اقوام کے مذہبی لٹریچر میں

نظام قائم کرنا ضروری نہیں ہے۔ اس کے برخلاف قرآن کریم کا حکم ہے کہ ہر جگہ، ہر حال میں قرآن کا نظام قائم کیا جائے۔ ایک شخص کو اس بات کی Choice ہے کہ وہ اسلام اختیار کرے یا اس کو رد کر دے یا اپنی دانست کے مطابق اسلام کی تنقیص کرتا رہے۔ لیکن اگر کسی شخص نے اسلام اختیار اور قبول کر لیا ہے، تو پھر اس کے پاس یہ Choice نہیں رہتی کہ وہ بخوشی اسلامی نظام میں رہے یا غیر اسلامی نظام میں زندگی بسر کرے۔ مسلمان ہونے کے عملی معنی ہی یہ ہیں کہ وہ شخص اس بات کا اقرار کرتا ہے کہ انسانوں کے وضع کردہ تمام نظام ہائے حیات باطل ہیں اور قرآن کریم کا عطا کردہ نظام ہی حق کی بنیادوں پر قائم ہے (3:19، 3:85، 3:83) قرآن کریم تو انسانوں کو قانون سازی کا اختیار ہی نہیں دیتا۔ اس کے نزدیک انسانوں کے وضع کردہ قوانین کفر، ظلم اور فسق پر مبنی ہوتے ہیں۔ سورۃ المائدہ میں تین آیات تسلسل کے ساتھ نازل ہوتی ہیں جن میں ارشاد عالی ہے وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ ﴿۴۴﴾ (5:44) الظّٰلِمُوْنَ ﴿۴۵﴾ (5:45) اور الْفٰسِقُوْنَ ﴿۴۷﴾ (5:47) ترجمہ: جو قوم قوانینِ خداوندی کے مطابق فیصلے نہیں کرتی وہ کافر، ظالم اور فاسق ہے ان تینوں آیات کریمات کا جو مفاد مولانا مودودی مرحوم نے اپنی تفسیر تفہیم القرآن میں تحریر فرمایا ہے وہ بہت عمدہ اور قابل مطالعہ ہے۔ انہوں نے تحریر فرمایا ''یہاں اللہ تعالیٰ نے ان لوگوں کے حق میں جو خدا کے نازل کردہ قانون کے مطابق فیصلہ نہ کریں تین حکم ثابت کئے ہیں۔ ایک یہ کہ وہ کافر ہیں۔ دوسرے یہ کہ وہ ظالم ہیں اور تیسرے یہ کہ وہ فاسق ہیں۔ اس کا صاف صاف مطلب یہ ہے کہ جو انسان خدا کے حکم اور اس کے نازل کردہ قرآن کو چھوڑ کر اپنے یا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین پر فیصلہ کرتا ہے وہ دراصل تین بڑے جرائم کا ارتکاب کرتا ہے۔ اولاً اس کا یہ عمل حکمِ خداوندی کے انکار کا ہم معنی ہے اور یہ کفر ہے ثانیاً اس کا یہ فعل عدل وانصاف کے خلاف ہے کیونکہ ٹھیک ٹھیک عدل کے مطابق جو حکم ہو سکتا تھا وہ تو خدا نے دے دیا تھا اس لئے جب خدا کے حکم سے ہٹ کر اس نے فیصلہ کیا تو ظلم کیا تیسرے یہ کہ بندہ ہونے کے باوجود جب اس نے اپنے مالک کے قانون سے منحرف ہو کر اپنا یا کسی دوسرے کا قانون نافذ کیا تو درحقیقت اس نے بندگی واطاعت کے دائرے سے باہر قدم نکالا اور یہی فسق ہے۔ یہ کفر، ظلم اور فسق اپنی نوعیت کے اعتبار سے لازماً انحراف از حکم خداوندی کی عین حقیقت میں داخل ہیں۔ ممکن نہیں ہے کہ جہاں وہ انحراف موجود ہے وہاں یہ تینوں چیزیں موجود نہ ہوں۔'' (مودودی صاحب کا اقتباس ختم ہوا) تاہم حقیقت یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رُو سے مومن وہ ہے جو قرآنِ کریم کو اللہ تعالیٰ کی طرف سے عطا کردہ واحد مکمل، آخری ضابطۂ حیات سمجھتا ہے۔ ہر مومن کا فرض ہے کہ وہ اس دنیا میں نظامِ خداوندی کے قیام کے لیے پوری پوری کوشش کرے۔ وہ جس ملک اور جس مقام میں بھی ہو وہ وہیں سے اس جدوجہد کو شروع کر دے کیونکہ نظامِ خداوندی کسی مقام یا کسی دور سے مختص نہیں ہے۔ اس کی پوری پوری کوشش یہی ہو کہ تمام باطل نظام ہائے حیات کو اکھیڑ کر پھینک دے اور اللہ کی زمین پر صرف اور صرف اللہ کے قانون اور اس کے نظام کو جاری کر دے۔ اس لئے کہ اسی نظام کی اطاعت اللہ اور رسول کی اطاعت ہوتی ہے۔ جو لوگ اللہ اور رسول کی اطاعت کرنا چاہتے ہیں ان کے لیے از بسکہ ضروری ہے کہ ان کا دیا ہوا نظام جاری کریں۔ جو لوگ اللہ کے

نظام کے علاوہ کسی بھی نظام کے ماتحت زندگی بسر کرنے پر رضامند ہوں۔ وہ اللہ اور رسول کے باغی، عادی اور نافرمان ہیں۔

اصل یہ ہے کہ قرآنِ کریم کا نظام چونکہ ایک مختصر سی مدت تک جاری رہا اور اس کے بعد یہ انسانیت کی بدقسمتی ہے کہ وہ جلد ہی منقرض ہو گیا اور پھر خلافتِ راشدہ کے بعد سے آج تک اس کی اقامت کی کہیں کوشش نہیں کی گئی۔ اس لئے اس کا تصور غیر مسلم حضرات اور مسلمانوں میں ایک تھیوکریسی کا سا آتا ہے۔ ہمارے مسلمان دانشور اور تھنکرز اس نظام کو اسی لئے ناپسند کرتے ہیں کہ وہ اس کو مولویوں کی حکومت سمجھتے ہیں اور ہمارے علماء کرام بھی اسی طرح سوچتے ہیں۔ ہمارے ان علماء نے پاکستان کے قیام کی سخت مخالفت کی تھی اور سیکولر نظام کی حمایت کی تھی لیکن جب یہی علماء باؤنڈری پار کر کے، پاکستان میں داخل ہوئے، تو یہ حضرات اسلامی نظام کے داعی بن گئے اور اس کے قیام کا مطالبہ کرنے لگ گئے۔ ہمارے علماء اسلامی نظام کا مطالبہ نہیں کرتے بلکہ یہ شریعت کے نفاذ کا مطالبہ کرتے ہیں۔ کیونکہ شریعت کے نفاذ سے ان کو اقتدار حاصل ہوتا ہے۔ شریعت ان کی ہی وضع کردہ ہے اس لئے اس کے نفاذ سے ان کو اقتدار ملتا ہے لیکن غور کرنے کی تو یہ بات ہے کہ ہندوستان کے تمام علماء سیکولر نظام کے قائل ہیں۔

حقیقت یہ ہے کہ اب انسان انسانوں کے وضع کردہ نظاموں سے تنگ آ چکا ہے، نیز یہ کہ اس دور میں تحریکِ طلوع اسلام نے اس تصور کو اس قدر زور سے اٹھایا ہے کہ اس دور کے دانشور اس سے متاثر ہو گئے ہیں لیکن افسوس یہ ہے کہ اسلامی نظام کا واضح قرآنی مفہوم کسی کے پاس بھی نہیں ہے۔ جب پاکستان کا مطالبہ پیش کیا گیا تھا، اور اسلامی نظام کا نعرہ بلند کیا گیا تھا، تو مہاتما گاندھی نے بھی رام راج کا نعرہ بلند کیا تھا حالانکہ ہندوؤں کے ہاں کسی نظام کا تصور نہیں ہے لنڈن میں بس کے سفر کے دوران ایک Priest ہمارے ساتھ ہماری سیٹ پر بیٹھ گئے۔ لنڈن میں پاکستان کی طرح بس میں اجنبی مسافروں سے بات نہیں کرتے۔ یہ وہاں دستور نہیں ہے۔ لیکن کسی طرح سے ان سے بات شروع ہو گئی اور چند منٹ کی گفتگو کے دوران انہوں نے بھی Kingdom of God کا تذکرہ کیا اور ہمارے استفسار پر یہ بیان کیا کہ اللہ کی حکومت دلوں پر ہوتی ہے۔ لنڈن میں ہی چند مرتبہ چرچ جانے کا اتفاق ہوا، تو چونکہ وہاں عموماً مذہبی لوگ ہی ہوتے ہیں انہوں نے ذرا تفصیل سے Kingdom of God کا ذکر کیا لیکن خوب یاد رکھیں کہ قرآنِ کریم کے علاوہ کسی مذہب میں کسی نظام کا کوئی تصور نہیں ہے۔ ان کے پاس صرف انسانوں کے وضع کردہ قوانین ہیں۔ جو قوانین ان کے Civil Laws شمار ہوتے ہیں وہ تو ان کے وضع کردہ ہیں ہی لیکن جو قوانین ان کے مذہبی نوعیت کے ہیں تو بھی ان کے اپنے ہی وضع کردہ ہیں۔ اللہ تعالیٰ کا نازل کردہ نظام، اور اس کے نازل کردہ قوانین صرف اور صرف مسلمانوں کے پاس ہیں لیکن افسوس کہ ہم مسلمانوں نے ان کی قدر نہیں کی اور قرآن کریم نے اسی کو فرمایا وَمَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (6:91) انسانوں نے اللہ کی وہ قدر نہیں کی جو اس کی قدر کرنے کا حق ہے۔

خوب واضح رہے کہ عقل انسانی، اتنی ترقی کر لینے کے بعد بھی اپنے لئے کوئی ضابطۂ حیات نہیں بنا سکی۔ البتہ گذشتہ صدی میں چند مفکروں نے باہم مل کر کوشش کر کے کمیونزم کا نظام پیش کیا تھا جو آپ کے سامنے ہی شروع بھی ہوا، اور ختم بھی ہو گیا۔ اب تک

جس قدر نظامِ حیات پر عمل کیا گیا ان میں سے کسی ایک نظام کے پاس بھی کوئی ایسی اساس نہیں تھی جس پر وہ نظام تکیہ کرے اور وہ اساس اس کو سنبھال رکھے۔ یہ صرف قرآن کریم کا نظام ہے جس کی اساس اس قدر مضبوط ہے کہ لَا انْفِصَامَ لَهَا ؕ (2:256) اس اساس کو کسی قسم کی شکست نہیں ہے۔ اب آپ قرآنِ کریم کی اساس ملاحظہ فرمائیں، اور غور سے اس کی طرف توجہ فرمائیں۔

زندگی (The Life) ہزاروں، لاکھوں سال کی مسافت آہستہ آہستہ طے کرتی ہوئی، اور رفتہ رفتہ ترقی کرتی ہوئی، اور جمادات اور نباتات کی منازل طے کرنے کے بعد حیوانیت کی سطح پر پہنچی۔ یہی زندگی جب حیوانیت کی سطح سے بلند ہوئی اور انسانیت کی منزل میں داخل ہوگئی تو اللہ سبحانہٗ تعالیٰ نے اس کو اپنی طرف ایک توانائی، ایک Energy ایک صلاحیت عطا فرمائی جس کو قرآن کریم نے روح کے لفظ سے تعبیر کیا ہے۔ یہ توانائی جب تک اللہ تعالیٰ کی طرف منسوب ہوتی رہی۔ تو قرآن کریم نے اس کو روحِ خداوندی ہی کہا ہے۔ لیکن جب یہ توانائی نوعِ انسانی کو مل جاتی ہے تو قرآنِ کریم اس کو نفسِ انسانی کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ توانائی تو یہ ایک ہی ہے لیکن فرق یہ ہے کہ جب یہ توانائی انسانیت کو بہ حیثیت ایک نوع کے مجموعی طور پر ملتی ہے، تو یہ نفس انسانی کے الفاظ کے ساتھ پکاری جاتی ہے۔ اور یہ توانائی ہی انسانیت کو حیوانیت سے ممیز اور ممتاز کرتی ہے۔ عام طور پر ساری دنیا اور ہر مذہب میں انسان کو ''جسم اور روح'' کا مرکب سمجھا جاتا ہے لیکن قرآن کریم انسان کو ''جسم اور نفس'' کا مرکب کہتا ہے اور یہ نفس انسانی ہی اسلامی نظام کی اساس محکم ہوتی ہے۔ جب تک کوئی شخص یا کوئی قوم اس نفس کے وجود پر ایمان نہیں لاتی۔ وہ حیوانیت کے درجہ میں رہتی ہے۔ وہ انسانیت کے دائرہ میں داخل ہی نہیں ہوتی اور مغرب کی تمام اقوام جو کہ نفسِ انسانی کی قائل نہیں ہیں، سب حیوانیت کی سطح پر رُکی ہوئی ہیں۔

اس وقت انسانوں میں تین تصورات مروج ہیں ایک تو سیکولر سٹیٹس ہیں جو مختلف Expediency پر چلتی ہیں اور ان میں ہی مذہب اور سیاست کی آمیزش ہوتی ہے۔ ان کے حوالہ سے ہی جناب پروفیسر پرویز ہود بھائی صاحب نے گفتگو کی ہے۔ ان ریاستوں کے پیشِ نظر نہ کوئی اصول ہوتے ہیں اور نہ کوئی مستقل اقدار۔ ان کے سامنے حق و باطل کا کوئی معیار نہیں ہوتا۔ اکثریت جس بات کو حق کہہ دیتی ہے وہ حق ہے۔ یہی اکثریت اگلے روز اس کو باطل کہہ دیتی ہے تو وہ ہی حق باطل ہو جاتا ہے۔ اس ریاست کے پاس Good اور Evil کو ماپنے کا کوئی معیار نہیں ہے۔ اسی اکثریت اور قوت کے زور پر امریکہ اسرائیل کو وجود میں لایا اور اسی اکثریت کے زور پر وہ عراق پر حملہ کرتا ہے۔ وزیراعظم بھارت نریندر مودی کو پہلے امریکہ نے Butcher of Gujarat کہہ کر ویزا دینے سے انکار کیا۔ پھر اسی مودی کو نہ صرف امریکہ آنے کی اجازت دی بلکہ اس کا پرزور استقبال کیا۔ آج جو کچھ برمی مسلمانوں کے ساتھ ہو رہا ہے، یہ سب اکثریت اور قوت کے زور پر ہو رہا ہے۔ ہم اگر یہ واقعات تحریر کرنا شروع کر دیں، تو ایک کتاب بآسانی تحریر کی جاسکتی ہے۔

دوسرا تصور روحانیت کا ہے ہمارے علماء کرام سے یہ تسامح ہوا کہ انہوں نے قرآن میں بیان کردہ روح اور نفس کے فرق کو Detect ہی نہیں کیا اور انہوں نے اس توانائی کو انسانوں میں منتقل ہونے کے بعد بھی روح ہی قرار دیا۔ قرآنِ کریم روحِ

خداوندی کا تو قائل ہے۔لیکن قرآن نے روحِ انسانی کی تردید کی ہے۔روحانیت کا تو لفظ بھی قرآن میں نہیں آیا۔روح اور روحانیت کا اقرار اقامت دین میں ایک بہت بڑی رکاوٹ ہے (اس موضوع پر ہماری کتاب ''روحانیت، اقامتِ دین میں ایک رکاوٹ'' ہماری ویب سائٹ پر پڑی ہے اس کا مطالعہ بہت فائدہ مند ہوگا)۔

قرآنِ کریم چونکہ روح اور روحانیت کا قائل نہیں ہے اس لئے اس نے اس کی نشوونما اور ترقی کے اصول بھی قرآن میں نہیں دیئے صرف اتنا کہہ دیا کہ: بَلِ اللّٰهُ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ وَلَا يُظْلَمُوْنَ فَتِيْلًا ﴿۴۹﴾ (4:49) مفہوم: انسانی ذات کی نشوونما صرف اس ضابطہ خداوندی کی رُو سے ہوسکتی ہے جسے اس نے اپنی مشیت کے مطابق بذریعہ وحی عطا کیا نیز فرمایا وَّلٰكِنَّ اللّٰهَ يُزَكِّيْ مَنْ يَّشَآءُ ۭ وَاللّٰهُ سَمِيْعٌ عَلِيْمٌ ﴿۲۱﴾ (24:21) انسانی ذات کی نشوونما خدا کے قانونِ مشیت کے مطابق ہی ہوسکتی ہے۔اس خدا کے قانون کے مطابق جو سب کچھ سنتا اور سب کچھ جانتا ہے۔

روح اور روحانیت کی Development کے طریقے ہمارے علماء کرام اور صوفیاء عظام نے خود ہی مقرر کئے ہیں لیکن ان میں سے ہر طریقہ وہ ہے جو قوم کو تباہ و برباد کرتا ہے۔روحانیین اس کائنات کے وجود کے ہی قائل نہیں ہیں۔وہ کہتے ہیں کہ اس کائنات کا وجود ہی نہیں ہے۔اس عقیدہ کو وحدت الوجود کا عقیدہ کہتے ہیں اور اسی نظریہ پر تصوف کی ساری عمارت قائم ہوتی ہے۔غالب کا مشہور شعر ہے۔

ہستی کے مت فریب میں آجائیو اسدؔ عالم تمام حلقۂ دام خیال ہے

نیز کہا۔

ہاں، کھائیو مت فریبِ ہستی! ہر چند کہیں کہ ہے، نہیں ہے

ہماری اردو اور فارسی کی ساری شاعری وحدت الوجود کے اشعار سے بھری پڑی ہے۔عربی زبان میں صرف ابن الفارض نے وحدت الوجود کے اشعار کہے ہیں۔جب یہ کائنات کے وجود کے ہی قائل نہیں ہیں، اس لئے یہ سائنس اور سائنسی علوم میں کوئی دلچسپی نہیں رکھتے۔یہ کائنات کی قوتوں کو نہ تو اپنے قابو میں لاتے ہیں اور نہ ہی ان سے کوئی فائدہ اٹھاتے ہیں۔یہ عقل وحواس سے حاصل کردہ علوم کو بھی کوئی اہمیت نہیں دیتے یہ علم حاصل کرنے کے باطنی ذرائع کے قائل ہیں اور صرف باطنی ذرائع سے حاصل کردہ علم پر بھروسہ کرتے ہیں، اور اسی کو علمِ حقیقی گردانتے ہیں۔یہ حضرات پرستش کے ذریعے روحانیت میں اضافہ کرتے ہیں۔نوافل، لمبے لمبے وظیفے، تسبیح ومناجات، ہزار ہزار دانوں کی تسبیحیں، زہرہ گداز ریاضتیں، یہ سب کچھ جنگلوں، پہاڑوں، کونوں، گوشوں میں، اس دنیا اور اس دنیا کی تمام چیزوں سے تنفر، ذہن کی اُپج Bent of Mind ہی دنیا کو حقیر سمجھنے کا بنالینا۔انکسار وتواضع کے اختیار کرنے سے زوال پذیری کو ہی اپنا مقصدِ حیات بنالینا۔اس وقت ساری مسلمان قوم تصوف اور ان نظریات میں ڈوبی ہوئی ہے۔بڑے بڑے اولیاء کرام، حضرت نظام الدین اولیاء، حضرت معین الدین چشتی زندگی کے Ideal ہیں۔اس کا نتیجہ آپ کے سامنے ہے۔اس کو بیان کرنے کی ضرورت ہی نہیں۔ساری مسلم امت میں ایک

سائنسدان، یا کوئی مفکر نہیں جس پر قوم فخر کر سکے۔ یا جو مسلمانوں کے مسائل حل کر سکے۔

تیسرا بیانیہ Narrative قرآن کریم کا پیش کردہ ہے۔ یہ نفس انسانی کے اقرار پر منحصر ہے۔ اسلامی نظام کی ساری عمارت اس نظریہ پر استوار ہوئی ہے۔ انسانی جسم میں ہر آن تبدیلی ہوتی رہتی ہے۔ ایک انسانی جسم ہزاروں Cells پر مرکب ہوتا ہے۔ انسانی جسم میں Cells ایسے ہوتے ہیں جیسے عمارات میں اینٹیں ہوتی ہیں۔ جسم انسانی کے یہ تمام Cells سات سال کے بعد بالکل تبدیل ہو جاتے ہیں اور جسم نئے Cells پر مرکب ہو جاتا ہے۔ جو چیز قائم رہتی ہے وہ یہ نفس انسانی ہے۔ یہی شعور ہے اور یہی انسان کے اعمال کی ذمہ دار۔ جب ہمارا کوئی پرانا دوست ہم کو ملنے آتا ہے تو ہمیں بہت خوشی ہوتی ہے۔ یہ خوشی ہمارے پاؤں یا ہمارے ہاتھ کو نہیں ہوتی۔ جسم کے کسی حصہ کو نہیں ہوتی بلکہ یہ خوشی ہماری اسی ذات کو ہوتی ہے۔ ہم آپ سے مصروف گفتگو ہیں اور بار بار ہم اور ہمارے کے الفاظ استعمال کر رہے ہیں ہمارا ہاتھ ہمارا پاؤں، ہماری جان کے الفاظ بولتے ہیں۔ ان الفاظ میں ہم سے مراد یہ نفس انسانی ہی ہوتی ہے۔ یہ نفس انسان وہ اساس محکم ہے جس پر دین کی عمارت قائم ہوتی ہے۔ انسان صرف جسم کا نام نہیں ہے کہ اس جسم کے ساتھ ایک اور شئی بھی ہوتی ہے جسے انسانی ذات کہتے ہیں۔ یہ وہ اصل چیز ہے جو کہ دین کی بنیاد ہوتی ہے۔ اگر اس ذات پر یقین و ایمان ہے تو پھر دین کا سلسلہ آگے بڑھتا ہے۔ اگر اس ذات پر ایمان نہیں ہے تو پھر دین کا سلسلہ آگے نہیں چلتا۔ پھر نہ اقدار کی ضرورت رہی ہے اور نہ مکافاتِ عمل کی۔ یہ ذات ہی اقبال کے ہاں خودی کہی جاتی ہے۔

اس ذات کو نشوونما دینا اور اس کو Develop کرنا انسان کی زندگی کا مقصد ہے۔ اس ذات کی نشوونما دو طریقوں سے ہو سکتی ہے۔ ایک طریقہ تو یہ ہے کہ آپ مستقل اقدار پر عمل کریں تو آپ کی نفس مضبوط اور مزکی ہوتی چلی جائے گی۔ جسم کے مرنے کے بعد یہ زندہ رہے گی۔ انسانی ذات خود ایک مستقل قدر ہے۔ باقی اقدار اس کی نشوونما کا ذریعہ بنتی ہیں اور ان اقدار میں سے ہر قدر پر عمل کرنے سے اسلامی نظام بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔ سب سے اہم قدر احترام آدمیت ہے۔ قرآن کریم نے فرمایا وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ (17:70)، حقیقت یہ ہے کہ ہم نے نوع انسانی کو قابل احترام بنایا ہے۔ احترام انسانیت ایک مستقل قدر ہے۔ اس سے ذات پات، حسب نسب، رنگ و نسل کے تمام فرق و امتیازات مٹ جاتے ہیں۔

دوسری قدر یہ ہے کہ اپنی کمائی ہوئی دولت کو دوسروں پر صرف کرو، وَيَسْـَٔلُوْنَكَ مَاذَا يُنْفِقُوْنَ ۙ قُلِ الْعَفْوَ ؕ (2:219) تم سے پوچھتے ہیں کہ دوسروں پر کیا خرچ کریں کہہ دو جس قدر تمہاری ضرورت سے زیادہ ہو، سب کے سب دوسروں کو دیدو ارشاد ہوا الَّذِيْ يُؤْتِيْ مَالَهٗ يَتَزَكّٰى ﴿۱۸﴾ (92:18) جو شخص اپنا مال دوسروں کو دیدیتا ہے اس کا تزکیہ نفس ہو جاتا ہے۔ وَمَنْ تَزَكّٰى فَاِنَّمَا يَتَزَكّٰى لِنَفْسِهٖ ؕ (35:18) جو دوسروں کی پرورش کرتا ہے۔ اس سے اس کی اپنی پرورش ہوتی ہے۔ اگرچہ لوگ اس قدر پر اور دیگر اقدار پر اپنے تزکیہ نفس کے لئے عمل کریں گے، لیکن آپ غور فرمائیں کہ ہر قدر پر عمل کرنے سے معاشرہ از خود بہتر سے بہتر ہوتا چلا جاتا ہے۔

(3) عدل کرنا بھی ایک مستقل قدر ہے اِنَّ اللّٰہَ یَاۡمُرُ بِالۡعَدۡلِ (16:90) یقیناً اللہ تعالیٰ عدل کا حکم دیتا ہے۔ دوسری جگہ ارشاد عالی ہے اِعۡدِلُوۡا ۟ ھُوَ اَقۡرَبُ لِلتَّقۡوٰی ۫ (5:8) عدل کرو کہ یہ تقویٰ کے قریب ہے۔

(4) کسی کی ذمہ داری کوئی دوسرا شخص نہیں اُٹھائے گا۔ یہ عدل کا تقاضہ ہے کہ ہر شخص اپنی صلیب خود اٹھائے۔ یہ نہیں ہوسکتا کہ ذمہ داری کسی کی ہو اور اس کو سرانجام کوئی دوسرا کرے وَلَا تَزِرُ وَازِرَۃٌ وِّزۡرَ اُخۡرٰی ۚ (6:164) ترجمہ: کوئی بوجھ اٹھانے والا کسی دوسرے کا بوجھ نہیں اُٹھائے گا۔ یہ مستقل قدر اس درجہ جامع ہے کہ زندگی کے ہر شعبے میں اس کا اطلاق ہوسکتا ہے۔

(5) کسی شخص کو کسی دوسرے پر ظلم کرنے کی اجازت نہیں ہوسکتی۔ جب عدل اس قدر اہم ہے تو ظاہر ہے کہ اس کی نقیض اسی درجہ قابل نفرت ہوگی قرآن نے ظلم کرنے کو ہی منع نہیں کیا بلکہ یہ فرمایا کہ کوئی شخص تم پر ظلم نہ کرے لَا تَظۡلِمُوۡنَ وَلَا تُظۡلَمُوۡنَ ﴿۲۷۹﴾ (2:279)، یعنی نہ کسی پر ظلم کرنا اور نہ کسی پر ظلم کرنے دینا۔ اپنی ذات میں اور اپنے قرآنی نظام میں اتنی قوت مہیا رکھنا کہ کسی ظالم کو تم پر ظلم کرنے کی جرأت نہ ہو۔ بلکہ وہ تم سے ڈرتے رہیں (8:60)۔

ہمارا یہ ارادہ تھا کہ ہم اس بات کو ذہن نشین کرانے کے لئے کم سے کم 25 اقدار کا حوالہ پیش کریں۔ لیکن اس سے مضمون بہت طویل ہوجائے گا۔ اس لئے صرف ان 5 اقدار پر اکتفاء کیا جاتا ہے۔

نفس انسانی کی نشوونما کا دوسرا طریقہ صفاتِ خداوندی کو اپنے میں پیدا کرنے کا ہے۔ ان صفات کو اپنے میں منعکس کرنے سے، یا ان صفات پر معاشرہ میں عمل کرنے سے بھی معاشرہ بہترین شکل اختیار کرلیتا ہے۔

نفخ روح سے انسان میں وہ ساری صلاحیتیں منتقل ہوجاتی ہیں، جو صفات کہی جاتی ہیں۔ صفاتِ خداوندی کا یہ تقاضا ہے کہ ان پر عمل کیا جائے۔ اللہ رب ہے ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسرے انسانوں کی ربوبیت کرے۔ اللہ تعالیٰ رزاق ہے۔ ہر انسان کا فرض ہے کہ وہ دوسروں کو رزق فراہم کرے۔ اللہ تعالیٰ کریم، رحیم، ستار وغفار وقہار ہے۔ ہر شخص کو ان صفات پر عمل کرنا ضروری ہے جو شخص ان صفات پر جس قدر عمل کرے گا اس کو اسی قدر قربِ خداوندی، تقرب الٰہی حاصل ہوگا۔ اسلامی مملکت کی اساس ان صفات پر ہی قائم ہوتی ہے۔

اسلامی مملکت کے اس نقشے کو آپ سامنے رکھیں یہ صرف اصول پیش کئے گئے ہیں۔ اسلامی نظام کی جو برکات اور اس کے جو ثمرات حاصل ہوتے ہیں۔ ہم نے ان میں سے کسی ایک کا بھی ذکر نہیں کیا ہے۔

قرآنِ کریم نے العبد غلام کے معنی میں استعمال کیا ہے۔ ارشاد ہوتا ہے یٰۤاَیُّہَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا کُتِبَ عَلَیۡکُمُ الۡقِصَاصُ فِی الۡقَتۡلٰی ؕ اَلۡحُرُّ بِالۡحُرِّ وَالۡعَبۡدُ بِالۡعَبۡدِ وَالۡاُنۡثٰی بِالۡاُنۡثٰی ؕ (2:178) اے ایمان والو، مقتولین کے بارے میں حکم قصاص تمہارے لئے لکھ دیا گیا ہے۔ آزاد کے بدلے آزاد، غلام کے بدلے غلام، اور عورت کے بدلے عورت۔ آپ غور فرمائیں اس آیت کریمہ میں قرآن کریم نے اَلۡعَبۡدُ کو اَلۡحُرُّ کے مقابلہ میں۔ یعنی غلام کو آزاد کے مقابلے میں استعمال کیا ہے غلام اپنے آقا کی اطاعت وغلامی کرتا ہے۔ کوئی غلام اپنے آقا کی پرستش نہیں کرتا۔ عبادت کا لفظ عبد کا مصدر

ہے۔اس کے معنی محکومی کرنا ہے،عبادت کے معنی پرستش کرنا ہرگز ہرگز نہیں ہو سکتے۔لفظ عبادت میں پرستش کا تصور دور دور تک کس بھی نہیں آتا۔ہمارے ہاں عبادت کے لفظ میں پرستش جو مفہوم داخل کیا گیا ہے وہ قرآن کے خلاف ہے۔

(1) پرستش کا تصور قرآن کے خلاف ہے۔مذہب میں پرستش ہوتی ہے جبکہ دین میں اطاعت ومحکومی ہوتی ہے۔جب حضرت موسیٰ ؑ اور حضرت ہارونؑ نے فرعون اور اس کے درباریوں کو ایمان لانے کی دعوت دی تو انہوں نے ان دونوں حضرات کے جواب میں کہا: اَنُؤْمِنُ لِبَشَرَيْنِ مِثْلِنَا وَقَوْمُهُمَا لَنَا عٰبِدُوْنَ ﴿23:47﴾ ترجمہ کیا ہم اپنے ہی جیسے دو آدمیوں پر ایمان لے آئیں اور حالت یہ ہے کہ ان دونوں کی قوم ہماری محکوم ہے۔اس آیت میں عابدون کا لفظ آیا ہے۔ظاہر ہے کہ بنی اسرائیل قوم فرعون کی پرستش نہیں کرتی تھی بلکہ وہ فرعون کی محکوم تھی۔اس لئے اس مقام پر بات واضح ہوگئی کہ عبادت کے معنی محکومی کے ہیں پرستش کے ہرگز نہیں ہیں۔

(2) سورہ الشوریٰ میں ہے کہ جب حضرت موسیٰ ؑ نے فرعون کو ایمان لانے کی دعوت دی اور اس سے یہ مطالبہ کیا کہ وہ بنی اسرائیل کو ان کے ساتھ جانے کی اجازت دے دے تو اس نے حضرت موسیٰ ؑ کے سامنے وہ احسانات شمار کئے جو اس نے بنی اسرائیل پر کئے تھے۔اس کے جواب میں حضرت موسیٰ ؑ نے نیم طنز اور نیم مزاحاً فرمایا کہ تم نے یہ بھی تو احسان کیا ہے کہ اَنْ عَبَّدْتَّ بَنِيْٓ اِسْرَآءِيْلَ ﴿26:22﴾ کہ تو نے بنی اسرائیل کو غلام بنالیا ہے یہ لفظ عبدت اسی لفظ ''عبد'' سے ہے۔فرمایا کیا تمہارے یہ احسانات ہیں کہ تم نے بنی اسرائیل کو غلام ومحکوم بنالیا ہے۔اس مقام پر عبادت کا مفہوم مزید واضح ہو گیا ہے۔

(3) سورہ الکہف میں محکومیت اور عبادت مترادف المعانی استعمال ہوتے ہیں۔اس سورہ میں ایک مقام پر ارشاد ہے وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿18:26﴾ خدا اپنے حق حکومت میں کسی کو شریک نہیں کرتا۔سورہ الکہف میں ہی دوسرے مقام پر ارشاد عالی ہے وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿18:110﴾ خدا کی عبادت میں کسی کو شریک نہ کرو۔یہاں آپ غور فرمائیں کہ ایک مقام پر فرمایا وَلَا يُشْرِكُ فِيْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا ﴿18:26﴾ اور دوسرے مقام پر ہے وَّلَا يُشْرِكْ بِعِبَادَةِ رَبِّهٖٓ اَحَدًا ﴿18:10﴾ جو وہاں (18:26) میں حُكْمِهٖٓ آیا تھا دوسرے مقام پر اس کے لئے بِعِبَادَةِ آیا ہے۔یہاں تصریف آیات سے واضح ہے کہ عبادت کے معنی محکومیت کے ہیں۔

(4) حضرت یوسف نے اپنے قید کے ساتھیوں سے کہا اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ (12:40) ترجمہ: حق حکومت خدا کے علاوہ کسی کو نہیں ہے،اور اسی آیت میں چند لفظ کے بعد ارشاد ہے اَمَرَ اَلَّا تَعْبُدُوْٓا اِلَّآ اِيَّاهُ ؕ (12:40)،اس نے حکم دیا ہے کہ اس کے علاوہ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو یہ غور فرمائیں کہ پہلے کیا کہ، اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ ؕ کے لئے ہے اور یہاں فرمایا اس کا حکم ہے کہ میرے سوا کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو اور لفظ عبادت ہی استعمال کیا گیا ہے۔ان آیات سے یہ بات خوب واضح ہوگی کہ قرآن کریم کی رُو سے خدا کی عبادت سے مراد اس کی محکومیت اختیار کرنا ہے۔یعنی قرآن کے مطابق حاکمیت خداوندی قائم کرنا۔

عبادت کے معنی محکومی کو پیشِ نگاہ رکھ کر، آیۂ کریمہ وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْاِنْسَ اِلَّا لِيَعْبُدُوْنِ ﴿51:56﴾ ترجمہ:

ہم نے جن وانس کو صرف اس لئے پیدا کیا ہے کہ وہ ہماری محکومی میں رہیں۔ اللہ تعالیٰ کی محکومی میں صرف اس وقت رہا جاسکتا ہے جب آپ اس کی حکومت قائم فرمائیں گے۔ ہمارے علماء کرام عبادت کا ترجمہ پرستش کرتے ہیں اور اس آیۂ کریمہ کا یہ مفہوم لیتے ہیں کہ ہم نے جن وانس کو اس لئے پیدا کیا کہ وہ ہماری پرستش کریں۔ پرستش کرنے کے طریقے ہمارے ہاں نوافل، لمبے لمبے چلے شمار کئے جاتے ہیں۔ اگر تخلیق انسانی کی غرض یہی رسوم پرستش ادا کرتے رہنا ہے تو ظاہر ہے کہ یہ رسوم دن رات میں چوبیس گھنٹے تو ادا نہیں کی جاسکتیں۔ ان رسوم کی ادائیگی کے علاوہ جو بھی کام ہم کرتے ہیں وہ مقصد تخلیق کے خلاف ہوگا۔ تخلیق کا مقصد اگر یہ رسوم پرستش ادا کرنا ہے تو یہ بزرگ حضرات بھی ہر وقت پرستش نہیں کرسکتے آپ خود غور کریں کہ اگر انسانی تخلیق کا مقصد صرف رسوم پرستش ادا کرتے رہنا ہوتا تو قرآن کریم وَسَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ (45:13) کیوں کہتا کہ یہ ساری کائنات تمہارے زیر تسخیر کردی گئی ہے۔ اُٹھو اور ان قوتوں کو قابو میں لاکر ان سے خود بھی فائدہ اٹھاؤ اور ساری انسانیت کو بھی اس کا فائدہ پہنچاؤ۔ اسلامی مملکت کی اساس صفاتِ خداوندی پر ہوتی ہے۔ اس کی صفات کو زیادہ سے زیادہ اپنے میں پیدا کرنا اور اس کے ساتھ ساتھ ان صفات کو اسلامی مملکت میں رائج کرنا، ہر مسلمان کا فرض ہے لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى ؕ يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ ۚ (59:24) انسانی ذات، انسانی معاشرہ، جو خدا کی صفات پر استوار ہوگا۔ ان میں یہ صفات منعکس ہوتی جاتی ہیں ان صفات کو عملی پروگرام میں لانے کے لئے کائنات کی ہر چیز کوشش کررہی ہے۔ اس آیت میں لہ کا لام، لام نافع کہلاتا ہے۔ صفات خداوندی کو انسانیت کے لئے نافع بنانے کے لئے کائنات کی ہر چیز کوشش میں لگی ہوئی ہے۔ تم بھی ایسا ہی کرو۔ صفاتِ خداوندی کو ہر طرف پھیلاتے جاؤ۔ ساری دنیا میں اُن کو عملاً جاری کرتے رہو۔ اللہ تعالیٰ کی صفت خالقیت میں شریک ہوکر کائنات میں اضافہ کرتے جاؤ۔ يَزِيْدُ فِي الْخَلْقِ مَا يَشَآءُ ؕ (35:1) وہ اپنی مخلوق میں برابر اضافہ کرتا جارہا ہے تمہارا بھی فرض ہے کہ اس کائنات میں اضافہ کرتے جاؤ، اور اپنی کوشش اور محنت سے اس کائنات کو آگے سے آگے بڑھاتے جاؤ۔ اسلامی مملکت کے ثمرات و برکات میں سے یہ ایک ثمر ہے۔ اس کے دیگر ثمرات اس کے ذریعے خود بخود برآمد ہوتے جاتے ہیں۔ یہ مضمون بہت طویل ہوگیا ہے۔ ان کی تفصیل بھی کبھی آئندہ میں آپ کی خدمت عالی میں پیش کردوں گا۔

رنگ او برکن مثالِ او شدی در جہاں عکسِ جمالِ او شدی

توجہ فرمائیں

اب آپ کنونشن 2017ء کی تصویریں جھلکیاں ہمارے فیس بک آفیشل پیج پر ملاحظہ کرسکتے ہیں جس کا لنک درج ذیل ہے۔/www.facebook.com/talueislam

مرزا شاہد برلاس، کراچی

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

تخلیق وارتقاء

1۔ کیا کفار نے نہیں دیکھا کہ آسمان اور زمین دونوں آپس میں جڑے ہوئے تھے، ہم نے ان کو علیحدہ کیا اور تمام جانداروں کو پانی سے بنایا پھر یہ لوگ ایمان کیوں نہیں لاتے ہیں؟ (23:30)

2۔ اور وہی ہے جس نے زمین کو پھیلایا اور اس میں پہاڑ اور دریا پیدا کئے اور ہر طرح کے پھلوں میں دو زوج بنائے، وہی رات کو ان کا لباس بناتا ہے، غور کرنے والے (لوگوں) کے لئے ان میں بہت سی نشانیاں ہیں (13:3)۔

3۔ انسان کو چپچپی مٹی سے تخلیق کیا (96:2)۔

4۔ اور ہم نے انسان کو مٹی کے جوہر سے پیدا کیا ہے۔ اس کو نطفہ بنا کر مضبوطی سے رکھا پھر نطفہ کو لوتھڑا بنایا۔ پھر لوتھڑے کو بوٹی بنایا پھر بوٹی کی ہڈیاں بنائیں اور پھر ہڈیوں پر گوشت پوست چڑھایا اور اس کو نئی صورت دی۔ تو اللہ سب سے بہتر بنانے والا بڑا بابرکت ہے (23:13)۔

چار قرآنی آیات کے اوپر دیے ہوئے ترجموں سے معلوم ہوتا ہے کہ ان آیات میں آسمان اور زمین کی تخلیق کے علاوہ تمام جانداروں کی پانی سے پیدائش کی بابت بتایا گیا ہے جو ظاہر ہے کہ مرحلہ وار ہی ہوسکتی ہے کیونکہ زندگی کی انواع میں تمام پودوں۔ درختوں اور جانوروں کے ساتھ خود انسان بھی شامل ہیں۔ چنانچہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ انسان کو بھی پانی سے بنایا گیا ہے ظاہر ہے کہ یہ کام مرحلے وار ہی ہوسکتا ہے۔ اوپر دی ہوئی نمبر 2 آیت میں تمام پھلوں اور پھولوں میں دو زوج یعنی نر اور مادہ کی موجودگی کا ذکر بھی کیا گیا ہے جس سے پودوں اور درختوں میں زندگی کا ثبوت بھی ملتا ہے جو نزولِ قرآن کے وقت کسی کو بھی معلوم نہ تھا یعنی وہ باتیں جو دورِ جدید میں نباتات کی سائنسی تحقیقات سے ثابت ہوئی ہیں۔ اوپر دی ہوئی آیت نمبر 3، خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ مِنۡ عَلَقٍ ۚ﴿۲﴾ (96:2)، علق کے ترجمے چپچپی مٹی اور گوشت کا لوتھڑا ہوتے ہیں، اگلی آیت نمبر 4 میں ماں کے رحم میں مرحلہ وار انسانی جنین میں تبدیلیوں کا تفصیل سے ذکر کرنے کے بعد آخر میں ہر جنین کو اس کی علیحدہ مخصوص صورت دینے کی بابت بتایا گیا ہے۔

مندرجہ بالا تفصیلات سے ہر عقل سلیم والا یہ سمجھ سکتا ہے کہ انسانی تخلیق جو اولاً پانی اور مٹی کے آمیزہ سے شروع ہوئی تھی نباتات اور حیوانات سے مرحلہ وار ترقی کرتے ہوئے آخرش انسان کی ذات پر منتج ہوئی۔ جو کرۂ زمین پر خدائی تخلیق کا شاہکار ہے۔

اردو داں طبقہ کی عربی زبان سے ناواقفیت کے سبب قرآن پاک کی روزانہ تلاوت کرنے والے اشخاص بھی زندگی بھر ان

مندرجات سے ناآشنا ہی رہتے ہیں۔ چنانچہ جب یہی بات تجربات سے گذار کر مثبت ثبوتوں کے ساتھ چارلیس ڈارون نے اسے ارتقاء کا نام دیکر کہی تو عیسائی قدامت پرست مذہبی رہنماؤں نے اس کو تخلیق کا متبادل گردان کر اس کی شدید مخالفت کی اور چونکہ جدید زمانہ میں ایک عیسائی محقق کی کہی ہوئی بات کو جھٹلانا ہمارے مذہبی طبقہ کے لیے بھی ایک لازمی جہاد بن گیا تھا جو خود نہ تو قرآن کو پوری طرح سمجھتا ہے نہ ہی قدیم مسلمانوں کی تحقیقات سے کلی واقف وآگاہ ہے۔ جس کا ذکر ہی اس مقالہ کا مقصد ہے۔ چنانچہ ہمارے علماء نے بھی عیسائی پادریوں کی اقتداء میں اس کے نظریہ ارتقاء کی بڑی شدومد سے مخالفت کی اور جس کے لئے انہوں نے بھی عیسائی پادریوں کے اعتراضات اور دلائل دہرانے پر ہی اکتفاء کیا خود یہ سمجھے بغیر کہ قرآن میں تو اس کے بلاتردید شواہد موجود ہیں۔ کسی بھی جدید نظریہ کی مخالفت چونکہ ہمارے معتدبہ جاہل عوام میں مقبولیت اور لیڈری کا باعث بنتی ہے اس لئے ہمارے معاشرہ میں لوگوں کے لئے مثبت باتوں کی بجائے منفی باتوں سے شہرت کا حصول بہت سہل ہوتا ہے جس کے لیے دلائل کی بجائے صرف جوش، ولولہ اور اسلام کے لئے اپنی جان قربان کرنے کا زبانی نعرہ اور عزم بہت ہی متاثر کن ثابت ہوتے ہیں۔

اس غلط فہمی کی ساری وجہ یہ ہے کہ ہمارا مذہبی طبقہ یہ سمجھتا ہے کہ پہلے اللہ تعالیٰ نے اپنے ہاتھ سے مٹی گوندھ کر گڑیا جیسا ایک پتلا بنایا اور جب وہ سوکھ کر تیار ہو گیا تو پھر اس میں اپنی روح پھونک کر اس کو زندگی بخش دی۔ اس طرح تین مرحلوں میں تخلیق کا تو یہ طبقہ خود بھی قائل ہے۔ البتہ اس سلسلہ میں اپنے تصور کی نفی کو اپنے عقائد کی نفی جانتے ہوئے اس کی مخالفت کرنا ہے۔ اس سلسلہ میں اس کی ایک دلیل یہ بھی ہوتی ہے کہ خدا کے لیے ہر بات خواہ وہ کتنی ہی بعید کیوں نہ ہو ممکن ہے۔ یہاں وہ لوگ یہ بات بھول جاتے ہیں کہ اللہ نے ہر چیز کی تعمیر۔ تشکیل اور تکمیل کے معین وقت کے اصول بھی تو خود ہی وضع کئے ہیں جن سے ہٹ کر مو برابر بھی کچھ نہیں ہوتا۔ کیونکہ یہ اس کی سنت (عادت) ہے اور اس نے اپنی سنت کو کبھی بھی تبدیل نہ کرنے کی بابت بھی قرآن میں اعلان کر دیا ہے یعنی اس کے قوانین، اصول اور طریقے غیر مبدل اور کائنات میں ہر جگہ جاری وساری ہیں۔ جو اس کی ذات کی وحدانیت کا ثبوت بھی ہیں۔

قرآن پاک میں کائنات بنانے کے لئے تخلیق کا لفظ استعمال کیا گیا ہے لیکن ہر تخلیق کے لئے وقت اور مرحلے درکار ہوں گے۔ سائنسدانوں نے مرحلہ وار تخلیق کے مختلف مرحلوں کو سمجھنے کے لئے، جو وقت کی بہت بڑی مدت میں سست روی سے روبہ عمل آتی ہے، ارتقاء کا لفظ وضع کیا ہے۔ یاد رکھنا چاہیے کہ کوئی بھی ارتقاء بغیر تخلیقی منصوبہ کے ممکن نہیں ہوسکتا۔ یعنی تخلیق اور ارتقاء، دونوں ہی آپس میں لازم وملزوم ہیں۔ لہٰذا ان کو دو مختلف اور متضاد چیزیں سمجھ کر دلائل دینا وقت اور توانائی دونوں ہی کا ضیاع ہے۔ جس میں آج کل ہمارے علماء مصروف اور ملوث ہیں۔

یہاں پر اس کی نشاندہی کرنا بہت ضروری ہے کہ مشہور سائنسدان آئن سٹائن کے نظریہ اضافت کے مطابق وقت یا زمانہ (زماں) خود کوئی مستقل شے نہیں ہے ___ بلکہ وہ بھی لمبائی چوڑائی اور گہرائی جیسی پیمائش کی طرح کی چوتھی پیمائش (Fourth dimension) ہے اور وقت کا بہاؤ بھی دریا کے مانند ہے جو کہیں تیز اور کہیں کم ہے۔ یعنی وقت کی رفتار

کائنات کی مختلف جگہوں پر مختلف ہوسکتی ہے چنانچہ آئن سٹائن کے نظریہ کے مطابق اگر روشنی کی رفتار یعنی ایک لاکھ چھیاسی ہزار میل فی سیکنڈ کے حساب سے سفر کیا جائے تو مسافر کے لئے وقت ٹھہر جائے گا!___ جس سے معدومیت وقت (Time dilation) کا نظریہ ابھرتا ہے جس کے سائنسی تجربہ کے لئے سائنسدانوں نے ایک ایٹمی گھڑی زمین پر اور دوسری ایٹمی گھڑی کو ایک راکٹ میں رکھ کر خلاء میں بھیجا جن دونوں کا وقت ایک ہی رکھا گیا تھا اس تجربہ سے ثابت ہوا کہ خلاء کی گھڑی زمین کی گھڑی کے مقابلہ میں سست روی سے چلتی ہے جس سے آئن سٹائن کے معدومیت وقت کا ثبوت مل جاتا ہے۔ اسی خیال نے مغربی فکشن اور فلموں میں (Time tunnel) ٹائم ٹنیل جیسی سواریوں کو روشناس کرایا ہے جن کے ذریعہ ماضی یا مستقبل کے سفر پر جانا ممکن ہے بشرطیکہ سواری کی رفتار روشنی کی رفتار سے زیادہ ہو۔

اس سلسلہ میں یہ بات دلچسپی کا باعث ہوگی کہ قرآن پاک کی ایک آیت کے مطابق کائنات کا ایک دن ہمارے پچاس ہزار سال کے برابر ہے۔ جس سے معدومیت وقت کا اصول بھی قرآن پاک سے معلوم ہوتا ہے۔ جن عربوں کو دس تک گنتی بھی مشکل سے آتی تھی ان کے لئے تو یہ عدد نا قابل تصور عدد تھا۔ اس لئے اس بات کا بھی امکان ہے کہ جاہلیت کی عربی میں پچاس ہزار کے عدد سے بڑا عدد ہی کوئی نہ ہوتا ہو___ لہٰذا وقت کا یہ عدد حقیقتاً پچاس ہزار سے کہیں زیادہ بڑا بھی ہوسکتا ہے۔

ایک دوسری آیت میں تخلیق کائنات کی بابت بتایا گیا ہے کہ خدا نے کُن کہا اور فیکون۔ یعنی سب کچھ ہوگیا۔ اس کا سادہ مطلب یہ ہے کہ وہ تمام زمانہ جو کائنات کی تعمیر میں صرف ہوگا وہ خدا کے لئے حال ہے اور کائنات کے خاتمہ کے بعد بھی اس کے لئے زمانہ حال ہی رہے گا۔ یہی ہی نہیں بلکہ ہمارا اپنا زمانہ بھی فیکون کا حصہ ہے یعنی کائنات کا ارتقاء ایک عملِ مسلسل ہے جو لمحہ لمحہ جاری وساری ہے جس کا اظہار علامہ اقبال نے اپنے ایک شعر میں اس طرح کیا ہے ؎

یہ کائنات ابھی ناتمام ہے شاید کہ آرہی ہے فلک سے صدائے کن فیکون

ماضی اور مستقبل تو ہم فانی انسانوں کے لئے ہیں خالق کائنات کے لئے تو وہ تمام زمانہ پلک جھپکنے سے بھی کم کا عرصہ ہی رہے گا۔ یعنی خالق خود تو وقت کے دریا کی تمام زندگی کے بہاؤ کو اس کے منبع سے اختتام تک بہ یک وقت دیکھ رہا ہے۔ یہودی اور نصرانی تاریخ کے مطابق تو انسانی تاریخ اور تخلیق آدم صرف دس بارہ ہزار سال کی بات ہی لگتی ہے۔ جبکہ موجودہ سائنسی دریافت کے مطابق جدید انسانوں یا ہوموسیپین (Homo sapiens) سے زیادہ قدیم انسان نما تو ایک اور مخلوق تھی جن کو (neanderthal) نینڈرکی وادی میں عمل میں آئی تھی۔ یہ مخلوق سات لاکھ سال پہلے افریقہ سے ترک وطن کرکے یوروپ منتقل ہوئی تھی جن کے دماغ ہم انسانوں سے 200 سینٹی میٹر بڑے تھے۔ ان کے قد انسانوں سے چھوٹے لیکن جسم چوڑے تھے۔ یہ جلد جوان ہوتے تھے اور ان کی اوسط زندگی صرف تیس سال تھی۔ بہت سے انسانوں کی طرح یہ لوگ بھی اپنے مردوں کو دفن کرتے تھے۔

جدید انسان افریقہ سے نینڈرتھل کے خاتمہ سے صرف پچاس ہزار سال پہلے ہی افریقہ سے یوروپ میں داخل ہوئے

تھے یعنی پچاس ہزار سال تک دونوں مخلوقات یوروپ میں مشترکہ طور پر رہتی رہی تھیں۔ نینڈرتھل کا پورا جینوم سائبیریا کے غار سے ملنے والی پچاس ہزار سال پرانی پنجہ کی ہڈی سے حاصل کیا گیا ہے۔ موجودہ افریقی انسانوں سے ان کا کوئی ڈی این اے بھی نہیں ملتا۔ البتہ سات لاکھ سال پہلے افریقہ سے ہجرت کے وقت ان کے ساڑھے ستانوے فیصد ڈی این اے اس وقت کے افریقی انسان نماؤں سے ملتے تھے۔ ان کے ڈی این اے کے تقابل سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ وہ اور جدید انسان چار لاکھ سال پہلے کسی مشترکہ جد سے علیحدہ ہوئے تھے۔ جبکہ موجودہ یوریشائی انسانوں میں ان کے بیس فیصد ڈی این اے اس طرح موجود ہیں کہ ہر یوریشیائی انسان کے دو فیصد ڈی این اے نینڈرتھل سے وراثت شدہ ہیں ارتقائی زینہ پر نینڈرتھل ہم سے کئی لاکھ سال پہلے آگے تھے کیونکہ افریقہ سے ہجرت کے بعد یوروپ کی رہائش کے دوران وہاں کے برفانی دور کی شدت کی سردی میں رہنے کے سبب انہوں نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا جب وہ قدرتی غاروں کو سکونت کے لئے استعمال کرتے تھے۔ جہاں ان کی مصوری کے نمونے وافر تعداد میں ملتے ہیں۔ یہ پتھر کے نوکدار بھالوں سے جنگلی جانوروں کا شکار کرتے تھے اور انہوں نے مچھلی پکڑنا۔ کشتیاں بنانا اور آگ پر جنگلی سبزیاں بھوننا بھی سیکھ لیا تھا۔

جبرالٹر کے قریب کے غاروں میں تو ان کے ابسٹریکٹ آرٹ یا تجریدی مصوری کے نمونے بھی دریافت ہو چکے ہیں۔ ان کے چہروں اور پسلیوں کی بناوٹ ہم سے مختلف اور ناک کے نتھنے چوڑے تھے۔ ان کا رنگ سفید بال سرخ اور جسم غالباً تلوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اب سے تیس ہزار سال پہلے یہ یکسر ناپید ہو گئے تھے۔ انسانوں نے ان سے جنسی تعلقات بھی قائم کر لئے تھے۔ ایک اندازہ کے مطابق ان کی تعداد صرف ستر ہزار تھی غالباً انسانوں نے غذائی قلت کے سبب ان کے مردوں کو مار کر کھالیا اور عورتوں کو رکھ کر ان سے جنسی تعلقات قائم کر لئے اس لئے یوریشیائی انسانوں میں ان کے ڈی این اے آج بھی موجود ہیں اور ان میں سے ہی کچھ لوگ سائبیریا سے ہو کر امریکہ گئے تھے۔ میرے خیال میں تو نینڈرتھل کے ڈی این اے ہی یوریشین ہوموسیپین میں ابسٹریکٹ خیالات کا منبع بنے اور اپنی اس وراثت کے سبب ہی افریقہ میں اپنی نوع کے انسانوں سے ذہنی طور پر بہتر ہو گئے۔

حضرت ابراہیمؑ کا خدا کی وحدانیت کا انقلابی تصور، انسانوں کی ذہنی بلوغت کی علامت تھا جس نے انسانوں کو دیوتاؤں کی پرستش اور توہم پرستی سے آزاد کر دیا تھا۔۔۔ ایک ایسے وقت میں، جب یونان کے عقل پرست فلسفی بھی اصنام پرستی سے مغلوب ہو کر دیوتاؤں کے فرضی دیومالائی خاندانی قصے موزوں کر رہے تھے اور مہذب ترین چینی بھی اپنے دیوتاؤں اور آگ اگلتی آسمانی بلاؤں کی قصہ خوانی میں گم تھے لیکن حضرت ابراہیمؑ کے بعد بنی اسرائیلی نبیوں علیہم السلام کا ایک طویل سلسلہ آگے چلا۔ جس کے تمام نبیؑ کسی نئے آنے والے نبیؑ کی بشارت دیتے تھے اور یوں خدا اور بندوں کے مسلسل رابطہ کی نوید دیتے رہتے تھے جس کا اختتام حضرت محمد ﷺ کے اس انقلابی اعلان پر ہوا کہ اب آئندہ کسی بھی شخص کا خدا سے براہ راست رابطہ نہیں ہوگا یہ اعلان بھی انسانی اذہان کی ایک عظیم زقند تھا جو بلاشبہ حضرت ابراہیمؑ کے اعلان سے بھی زیادہ شاندار اور اہم تھا جس نے نبوت کے خاتمہ کا اعلان کیا۔ اس اعلان نے

خالق اور انسانوں کا براہ راست رابطہ ہمیشہ کے لئے ختم کر دیا تھا۔ جس کی اہمیت پر خاطر خواہ غور نہیں کیا گیا کیونکہ بعد کے مذہبی غوغا میں اس کی آواز ماند پڑ گئی تھی جس نے تمام مصنوعی خداؤں اور توہمات کا خاتمہ کر کے انسانوں کو کائنات پر اعتماد بخشا اور اس پر غور۔ فکر اور تجزیہ کرنے کی یہ کہہ کر ترغیب دی کہ کائنات کا نظام کسی دیوی یا دیوتا کی خوشنودی یا کسی فرضی خدا کی ناراضگی پر منحصر نہیں ہے۔۔۔ اور خالق کائنات کو سمجھنے کے لیے اس کی تمام آیات (نشانیاں) کو کائنات میں تلاش کریں جو ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔۔

اس وسیع و عریض کائنات کا تمام نظام لگے بندھے ضوابط اور قوانین کے مطابق ہوتا ہے جس میں خالق کائنات خود بھی کبھی تبدیلی نہیں کرتا جس کا اعلان بھی قرآن میں یہ کہہ کر کیا گیا ہے کہ اللہ کی سنت کبھی تبدیل نہیں ہوتی کیونکہ یہ اس کی عادت ہے۔ اس خالق کے ادراک کے لئے نہ جنگلوں کی خاک چھاننے کی ضرورت ہے نہ ہی تکلیف دہ چلوں اور مجاہدوں کی بلکہ غور و فکر اور ذہنی تجزیوں سے کتاب کائنات کا مطالعہ کر کے اس کا ادراک حاصل کیا جا سکتا ہے۔ جسے جدید زبان میں سائنس کہا جاتا ہے۔

بدقسمتی سے ہم مسلمانوں نے بھی دوسرے مذاہب کے زیر اثر اپنے خدا کو ایک دیوتا یا ناک چڑھے بادشاہ جیسا بنا دیا جو ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتا ہے اور ذرا سی بات پر خوش ہو کر انعامات سے نوازتا ہے۔ جو اپنی تعریف پر خوش ہوتا ہے۔ لہٰذا ہمیشہ اس کی تعریف کرتے رہنا چاہئے۔ خالق کائنات تو ان تمام خیالات و جذبات سے انتہائی بلند ہے لیکن انسانوں نے اپنے خالق کو بھی انسانوں جیسے جذبات کا منبع بنا کر اس کا ایک نیا بت تراش لیا۔ جو خود اصنام پرستی کی شکل اختیار کر چکا ہے یہاں تک کہ اسے عاشق/معشوق بھی بنا لیا ہے۔

تمام انسانوں میں سے وہ اشخاص جنہوں نے فطرت کے کسی چھوٹے سے راز یا قانونِ فطرت کو دریافت کیا اور اس کو استعمال کرتے ہوئے انسانی فلاح کی کوئی دوا یا کوئی مشین وضع کی تھی۔ ہمارے نزدیک وہ تمام حضرات نابغہ وقت۔ محسن انسانیت اور دانا ترین گردانے جاتے ہیں جنہوں نے خود نہ تو کوئی قانون فطرت وضع کیا نہ اس کی تعمیر کی اور نہ ہی اس کی تخلیق، تشکیل یا تکمیل کی۔۔۔ اگر وہ لوگ صرف ان قوانین میں سے کسی ایک قانون کے دریافت کنندہ ہو کر عظیم انسان ہیں تو ان قوانین اور اصولوں کا واضع اور خالق کتنا عظیم ہوگا!۔۔۔ آپ اس کو اللہ کہیں۔ فطرت کہیں یا ذہن عظیم (Super Mind) آپ اس کو نہ دیکھ سکتے ہیں بس اس کی صناعی۔ طریقہ کار اور اصولوں کی سمجھ حاصل کر کے اسے دریافت کر سکتے ہیں۔

یہ بات بلاشبہ پاکستانی مسلمانوں کے لئے بہت تعجب خیز ہوگی کہ مسلم علماء کے نزدیک سب سے پہلے ارتقاء کا نظریہ ابوعثمان عمر بن بحر الجاحظ معتزلی (متوفی 869 عیسوی) نے اپنی کتاب الحیوان میں پیش کیا تھا۔ جس سے دوسرے مسلمان علماء مثلاً الدمیری، البیرونی، ابن طفیل اور ابن خلقان کی تحریریں بھی متاثر ہوئی تھیں۔ جاحظ نے اپنی تحریروں میں پودوں سے جانوروں کے ارتقاء اور جانوروں سے انسان کی ارتقاء کی بابت لکھا ہے۔ اس کے علاوہ اس نے زندگی کی جدوجہد۔ ماحول سے مطابقت اور جانوروں کی نفسیات کی بابت بھی اپنے خیالات کا اظہار کیا ہے۔ ڈاکٹر علامہ اقبال جاحظ کے ارتقاء کی بابت خیالات سے بہت متاثر تھے اور انہوں نے اس کو مسلم دنیا میں نظریہ ارتقاء کا پہلا مفکر قرار دیا اور لکھا ہے۔ یہ جاحظ ہی تھا جس نے سب سے

پہلے جانوروں کی ان تبدیلیوں کی بابت بتایا تھا جو ہجرت اور ماحول کی بدولت وجود میں آتی ہیں۔ اس کے علاوہ جارج سارٹن نے اپنی انگریزی کتاب ''Introduction of History of Science'' میں لکھا ہے۔ ''جاحظ کی کتاب الحیوان میں بعد کی بہت سی تھیوریز کے جرثومے موجود ہیں جن میں ارتقاء، ماحول سے موافقت اور جانوروں کی نفسیات شامل ہیں۔''

ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق ارتقاء کا نظریہ تفصیل سے ایک ایرانی مسلم عالم ابن مسکویہ (ابوعلی احمد ابن محمد ابن یعقوب ابن مسکویہ (متوفی 1030 عیسوی) نے اپنی کتاب ''الفوز الاصغر'' میں پیش کیا تھا۔۔۔ ڈاکٹر حمید اللہ کی تحریر کے اقتباس کا اردو ترجمہ مندرجہ ذیل ہے۔

''اس کتاب کی تحریر کے مطابق سب سے پہلے خدا نے مادہ تخلیق کیا جس کے بعد اس میں نمو کی توانائی پیدا کی۔ اس توانائی نے ابخارات پیدا کئے جنہوں نے ایک معین وقت میں پانی کی شکل اختیار کر لی۔ تخلیق کا اگلا مرحلہ موجودات کی پیدائش تھا۔ جب ایک عرصہ میں انواع واقسام کی چٹانیں اور پتھر پیدا ہوئے جن کی اعلیٰ ترین قسم مرجان (Corals) ہیں گو مرجان ایک پتھر ہے لیکن اس کی شاخیں درختوں اور پودوں سے مشابہ ہیں۔ موجودات کے بعد زندگی کا اگلا ارتقاء نباتات کی صورت میں ہوا جس کا اختتام ایک ایسے درخت کی پیدائش پر ہوا جس کی خصوصیات نچلے درجہ پر جانوروں سے مشابہ تھیں۔ وہ درخت کھجور کا ہے۔ جس میں جانوروں کی طرح نر اور مادہ ہیں اور جو اپنے اطراف کی شاخیں کاٹنے سے نہیں مرتا لیکن اگر اس کی چوٹی یعنی سرکاٹ دیا جائے تو مر جاتا ہے۔ اس لئے کھجور کے درخت کو نباتات میں اعلیٰ ترین سمجھا جاتا ہے جسکی ادنی ترین درجہ پر جانوروں سے مشابہت ہے۔ جس کے بعد جانور کی ادنی ترین قسم پیدا ہوئی جو آخر میں بندر کی شکل پر منتج ہوئی۔ یہ بیان ڈارون کا نہیں ہے بلکہ ابن مسکویہ کا ہے اور صراحتاً یہی کچھ ''خطوط اخوان الصفا'' میں بھی درج ہے۔ مسلم مفکرین نے لکھا ہے کہ بندر کا ارتقاء ایک نچلے درجہ کے جنگلی آدمی پر ہوا جو اعلیٰ درجہ پر بڑھ کر انسان بنا۔ اس درجہ سے آگے جا کر وہ فرشتہ بن جائے گا۔ اور بلاشبہ فرشتوں سے اعلیٰ درجہ پر صرف خدا ہے۔ ہر چیز اسی سے شروع ہوتی ہے اور اسی کی طرف لوٹ جاتی ہے۔''

ڈاکٹر حمید اللہ کے مطابق ڈارون کے کیمبرج میں قیام کے دوران مذاہب کے تقابلی مطالعہ کے لئے اس نے عربی کی تعلیم بھی حاصل کی تھی جس کے بعد اغلب امکان کے مطابق اس نے ابن مسکویہ کا مطالعہ ضرور کیا ہوگا۔ جس کے بعد اس نے اس کے تجرباتی شواہد حاصل کرنے کے بعد اپنی کتاب (Origin of Species) انواع کی ابتداء، تحریر کی تھی۔ یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ ابن مسکویہ کے نظریہ ارتقاء کے پیش کرنے کے بعد کی گذشتہ آٹھ صدیوں تک کسی مسلم مفکر یا عالم نے اس کی تردید نہیں کی لیکن موجودہ دور میں معمولی معلومات اور تعلیم کے لوگ بھی اس کی نفی میں آگے آگے ہیں خدا کا شکر ہے کہ جدید تعلیم کی بدولت ہمارے طبقہ کے اذہان سے مذہبی توہمات کی گرد صاف ہوئی ہے جس نے ہماری نظروں کی دھند کی صفائی کر کے ہمیں واضح طور پر دیکھنے کے قابل بنا دیا۔ اور بلاشبہ جس کے اولین نقیب سرسید احمد خاں مرحوم تھے اور جسے علامہ اقبال اور پرویز صاحب نے آگے بڑھایا ہے۔

ڈاکٹر انعام الحق، اسلام آباد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

(قسط نمبر10)

دو قومی قرآنی نظریہ پر مطالبہ پاکستان

احساس کا اصطلاحی مفہوم:

فلسفہ میں احساس کا اصطلاحی مفہوم یہ لیا جاتا ہے۔

''قدر آفرینی کا داخلی عمل۔ پسند کرنا، ناپسند کرنا، ترجیح دینا، محسوسات کا ان کے وقوفی یا ارادی پہلو سے قطع نظر تجربہ۔'' داخلی کیفیت جو معروض سے قطع نظر شعور کا رویہ ظاہر کرے۔

احساس کی مختلف کیفیتیں:

علم النفسیات میں احساس کو درج ذیل کیفیتوں میں تقسیم کر کے زیرِ بحث لایا جاتا ہے، جن سے عُلمائے نفسیات حیوان سے انسان تک کے ارتقائی عمل کو دریافت کر کے سامنے لاتے ہیں۔

1۔ جبلت/ عادت

2۔ ہیجان

3۔ جذبات

1۔ جبلت (Instinct) کا مفہوم:

جبلت کا لغوی مفہوم لغت میں نفسیات کے حوالے سے ایک خلقی خود کار تحریک جو انسانوں اور حیوانوں میں بنیادی حیاتیاتی ضرورتوں کی تسکین کے لیے ہوتی ہے جو با مقصد اور ہدایتی رویے پر منتج ہوتی ہے۔

ایک غیر اختیاری رجحان یا تحریک جو خاص حالات میں خاص انداز سے عمل کرتی ہے یعنی کسی چیز کی فطری صلاحیت۔)

نفسیات میں جبلت کی تعریف میکڈوگل کے حوالے سے یوں کی گئی ہے کہ

وہ موروثی طبعی نفسی میلان جو مخصوص قسم کے مہیجات سے بیدار ہو کر فرد میں مخصوص قسم کا ہیجانی اشتعال اور اس (ہیجانی اشتعال) کی مناسبت سے خاص قسم کے عمل کا ارتکاب کرنے کی طلب پیدا کرتا ہے۔

اسی طرح جبلی کردار کسی جبلت کے مشتعل یا بیدار ہونے کے نتیجے میں وجود آنے والا کردار ہے۔ یہ ایسا غیر اکتسابی اور اضطراری فعل ہے، جو آموزش اور تربیت کا بھی نتیجہ نہ ہو۔)

فلسفہ کی زبان میں جبلت، عضویہ کا مخصوص مہیج کی موجودگی میں معروض کا ادراک کرنے، اس سے متاثر ہونے، اس کی جانب یا خلاف عمل کرنے کا خلقی، غیر اکتسابی یا وہبی میلان ہوتا ہے۔)

یہ جانوروں کے اندر ایسی قوت مانی جاتی ہے، جو بغیر کسی ارادے کے کام کرتی ہے اور خارجی عمل کے ردعمل کے طور پر ظاہر ہوتی ہے۔ یہ ردعمل بالعموم مستقل نوعیت کا ہوتا ہے اور اس کے بارے میں پیش گوئی کی جاسکتی ہے۔

عادت کا مفہوم:

جبلت اور عادت کو بظاہر مترادف معانی میں لیا جاتا ہے اور وہ ایک ہی قسم کا عمل کرتے دکھائی دیتے ہیں، لیکن ان میں نمایاں اہمیت کا حامل فرق بھی پایا جاتا ہے۔

اِن کو مترادف معانی میں اِس لئے لیا جاتا ہے کہ جبلت اور عادت دونوں ایسے اندرونی میلانات یا رجحانات ہیں جو میکانکی افعال کی شکل میں ظاہر ہوتے رہتے ہیں۔ دونوں میں افعال کم وبیش ایک ہی انداز میں سرزد ہوتے ہیں اور دونوں میں شعور کی موجودگی غیر اہم ہوتی ہے۔

العادۃ طبیع ، الثانیہ کو طبیعت اوّلیٰ یعنی جبلت پر اضافہ کر کے طبیعت ثانیہ یا عادت کا نام دیا جاتا ہے۔

جبلت اور عادت میں فرق:

جبلت اور عادت میں نمایاں اور اہم فرق سامنے یوں آتا ہے کہ جبلت میں تبدیلی ممکن نہیں لیکن عادت میں تبدیلی کی قوت موجود ہے۔ اِس بنیادی فرق کے علاوہ یہ بھی دیکھا گیا ہے کہ:

1۔ جبلتوں میں آموزش کی ضرورت نہیں ہوتی۔ جانور بغیر سیکھنے کے جنسیت کا مظاہرہ کرتے ہیں۔ مگر عادات سیکھنے سے آتی ہیں۔ جو انسان حالات کے مطابق جائزہ لے کر سیکھتے ہیں۔

2۔ ایک نوع کے تمام افراد میں کم وبیش ایک جیسی جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ مگر افراد میں عادات مختلف ہوتی ہیں۔

3۔ جبلت کے اعمال میں میلانات طبیعی کا ہونا ضروری نہیں جبکہ عادت میں میلانات کو قبول کرنا ضروری ہے۔

ہم دیکھ رہے ہیں کہ جبلت اور عادت، حیوانوں اور انسانوں دونوں میں موجود ہوتی ہیں لیکن نوع میں فرق ہونے کی وجہ سے انسانوں میں حیوانوں سے ایک الگ اور ممتاز مقام رکھتی ہیں۔

انسانی زندگی میں ودیعت کردہ جبلتیں:

نفسیات کے حکمائے قدیم حیوانوں کی حرکات کو جبلی، لاشعوری اور میکانکی قرار دیتے تھے اور انسانوں کے افعال کو جبلی، شعوری اور ارادی گردانتے تھے۔ اِس کے برعکس جدید حیاتیات کے علم کے ماہرین انسانوں اور حیوانوں کے باہمی رشتے پر زور دیتے ہیں۔ اُن کا عقیدہ ہے کہ حیوانوں کی طرح انسانوں کا کردار بھی بڑی حد تک جبلی رجحانات پر مبنی ہوتا ہے۔

افادی نقطہ نظر سے انسانی جبلت کا تجزیہ کیا جائے تو انسان چند بنیادی رجحانات کے عمل اور احساس کے موروثی محرکات

کے ساتھ پیدا ہوتا ہے۔ پروفیسر مارشل نے ان موروثی رجحانات کی تقسیم درجِ ذیل جبلت کے تین بنیادی مقاصد کے تحت کی ہے۔

1۔ انسان کی بقاء (Self Preservation) کے بنیادی مقاصد کے نقطہ نظر سے جن میں وہ چند ایک اہم جبلتوں، مثلاً بھوک، پیکار، فرار اور کھیل کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

2۔ جذبہ تغلّب (Self Aggression) کے بنیادی مقاصد کے نقطہ نظر سے وہ انسان کا اجتماع میں قائم جبلتوں، مثلاً بزم آرائی، مقبول ہونے اور ایک دوسرے سے آگے جانے کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

3۔ نسلی بقاء (Self Procreation) کے بنیادی مقاصد کے نقطہ نظر سے وہ کچھ اور جبلتوں مثلاً توالد اور والدانہ شفقت کی طرف توجہ دلاتا ہے۔

یہ ثابت کرنا آسان ہے کہ انسان بھی حیوانوں کی طرح جبلتیں رکھتا ہے۔ مگر اس کی جبلتوں کا گنوانا آسان نہیں۔ حکمائے نفسیات انسانی جبلتوں کے متعلق مختلف نظریات پیش کرتے ہیں۔ بعض حکماء جبلتوں کی کم سے کم تعداد کے قائل ہیں اور بعض جبلتوں کی تعداد کو اتنا بڑھا دیتے ہیں کہ وہ ہر انسانی فعل کو ایک علیحدہ جبلت کا مظہر شمار کرتے ہیں۔

انسانی جبلتوں کی البتہ میکڈوگل کی جماعت بندی سند کا درجہ رکھتی ہے۔ اس کے مطابق انسان میں سات اہم جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ اور وہ مندرجہ ذیل ہیں۔ اس کے خیال میں ان کی تعداد چالیس سے کم نہیں ہے، لیکن اس نے سات اہم کی نشاندہی کی ہے۔

جبلتوں کی جماعت بندی:

1۔ جبلت فرار (Instinct of Plight) یعنی اپنی بقا کی خاطر انسان کا خطرات کے سامنے فرار اختیار کرنا۔

2۔ جبلت تنفر (Instinct of Repulsion) یہ بدبودار اور بدذائقہ اشیاء سے پیدا ہوتی ہے۔

3۔ جبلتِ تجسّس (Instinct of curiosity) یہ عجیب وغریب شے سے مشتعل ہو کر اس کے مشاہدہ کرنے سے ہوتی ہے۔ یہ ماحول اور کسی نئی اور انوکھی چیز کی تفہیم پر آمادہ کرتی ہے۔

4۔ جبلت نزاع پسندی (Instinct of Pugnacity) یہ کوئی خاص مہیج نہیں ہوتا۔ یہ جبلّت ہر جبلی فعل کے راستے میں کسی رکاوٹ کے پیدا ہونے سے بیدار ہو سکتی ہے۔ خصوصاً دشمن سے مقابلے کی صورت میں۔

5۔ جبلت خود ادعائی اور تحقیر نفس (Instinct of self_assertion and Self_abasement) دوسروں کی موجودگی میں ظاہر ہوتی ہیں۔ اپنے سے کمتر لوگوں کے سامنے خود ادعائی کا مظاہرہ ہوتا ہے جبکہ اپنے سے بہتر اشخاص کے سامنے عجز وانکسار کا مظاہرہ ہوتا ہے۔

6۔ والدینی جبلت (Parental instinct) اس جبلت کے باعث ماں بچوں کو پالتی ہے۔ عام طور پر نر کی نسبت

مادہ میں یہ جبلت شدید ہوتی ہے۔

7۔جبلت جنسی (Sex instinct) یہ مقابل جنس کی موجودگی میں بیدار ہوتی ہے۔اور افزائش نسل کے لیے ضروری ہے۔

ان جبلتوں کی جماعت بندی میں پہلی چار جبلتیں اوپر بیان کی گئی پہلی انسان کی بقاء، پانچویں دوسری جبلت خود ادعائی اور آخری دو جبلتیں تیسری نسل کی بقاء کے لیے ضروری خیال کی جاتی ہیں۔

یہ جبلتیں انسانی عضویہ یا کم از کم نسل انسانی کے بقاء اور تحفظ کا وظیفہ انجام دیتی ہیں۔لیکن فرد کو اس کا شعور نہیں ہوتا، کیونکہ وہ جسمانی یا ذہنی اعمال نہیں۔یہ عمل کے جبلی میلانات ہیں۔اور ہم انھیں صرف ان کے پیدا کردہ اعمال ہی کے ذریعے جان سکتے ہیں۔

جب بھی جبلی میلانات اپنی جبلتوں سے متاثر اور مشتعل ہو کر افعال کے مُرتکب ہوتے ہیں، تو اُن کے احساسات کو نفسیات میں ہیجان کا نام دیا جاتا ہے۔لہٰذا یہاں ان کے نفسیاتی عِلم کا مُختصر طور پر جائزہ لیا جاتا ہے

2۔ ہیجان کا جائزہ:

ہیجان سے مراد عضویے کی ایسی برانگیختہ کیفیت جس میں خود اختیاری نظام عصبی (غدود، عضلات) درجہ اعتدال سے زیادہ فعال ہوتے ہیں اور مخصوص قسم کے جسمانی مظاہر مثلاً خون کے دباؤ حرکت قلب اور تنفس میں اضافہ ہو جاتا ہے۔

اس سے مزید مراد احساسات کا فوری اور شدید اُبال جو محرک کا کام کرتا ہے۔

جدید حکمائے نفسیات ہیجان کو جبلت کا احساسی پہلو کہتے ہیں۔اس کا مطلب ہے کہ ہیجان جبلت ہی کے مشتعل ہونے پر معرض وجود میں آتا ہے۔چنانچہ ہر ہیجان کی بنیاد جبلی ہوتی ہے۔اس لیے انھوں نے ہر جبلت کے بالمقابل مشتعل ہونے پر ہیجان کو درج ذیل طریقے سے واضح کیا ہے۔

1۔جبلت فرار سے تنفر کے ہیجان	2۔جبلت تجسس سے حیرت کے ہیجان
3۔جبلت نزاع پسندی سے غُصہ کے ہیجان	4۔جبلت خود ادعائی اور تحقیرِ نفسی سے برتری
5۔والدینی جبلتِ ترحم سے کمتری کے ہیجان	6۔جبلتِ جنس سے شہوت کے ہیجان

اوپر کی مثال سے واضح ہوتا ہے کہ جبلت ذہن کا ایک مستقل رجحان ہے مگر ہیجان ایک عارضی کیفیت ہے۔

ہیجان کو حیوانی درجہ میں رکھا جاتا ہے کیونکہ اس میں جبلت کے احساس ہی کا راج ہوتا ہے، چاہے وہ انسان کی منفعت میں ہوں یا پھر اُن کو نقصان پہنچانے کا موجب ہوں۔

علم النفسیات میں حیوان سے انسان کے ارتقاء کے نظریہ کو ''احساس کے ہیجان پر قابو رکھنے'' کے عنوان کے تحت زیر بحث لایا جاتا ہے۔قرآن نے انسان کی ایسی حیوانی زندگی کی حالت کو الھوٰی کی اصطلاح سے متعارف کرایا ہے۔

الھوٰی بطور قرآنی اصطلاح:

عربی زبان میں ''الھوی'' لفظ کا مادہ ''ھ و ی'' ہے۔ امام راغب نے الھوٰی کے معنی اوپر سے نیچے گرنے کے کیے ہیں۔

قرآن کے نازل ہونے کا مقصد خدا کا یہ چاہنا تھا کہ اس کی روشنی میں انسان، آسمان کی بلندیوں تک پہنچ جائے۔ لیکن ان میں اکثر اپنی سرکش خواہشات کا اتباع کر کے زمین کی پستیوں کے ساتھ جا چپکتے ہیں اور پھر اس کی مثال اس کتے کی سی ہو جاتی ہے جو ہر وقت زبان لٹکائے پھر رہا ہو۔

وَلَوْ شِئْنَا لَرَفَعْنٰهُ بِهَا وَلٰكِنَّهٗٓ اَخْلَدَ اِلَى الْاَرْضِ وَاتَّبَعَ هَوٰىهُ ۚ فَمَثَلُهٗ كَمَثَلِ الْكَلْبِ ۚ اِنْ تَحْمِلْ عَلَيْهِ يَلْهَثْ اَوْ تَتْرُكْهُ يَلْهَثْ ؕ (7:176)

''اور ہم چاہتے تھے کہ بلند کرتے اس کا رتبہ ان آیتوں کی بدولت لیکن وہ زمین ہی کی طرف جھکا اور اپنی خواہشوں ہی کا پیرو بنا رہا۔ تو اس کی مثال کتّے کی سی ہے کہ اس کو دھتکارو جب بھی زبان لٹکا لے یا چھوڑ دو، جب بھی زبان لٹکائے رکھے۔''

قرآن مومنین کو ہدایت کرتا ہے کہ جب تمہارے پاس وحی کی روشنی میں واضح راستہ سامنے آ گیا ہے تو ان لوگوں کے جذبات کا اتباع نہ کریں جو علم نہیں رکھتے۔

وَمَنْ اَضَلُّ مِمَّنِ اتَّبَعَ هَوٰىهُ بِغَيْرِ هُدًى مِّنَ اللّٰهِ ؕ (28:50)

''اور اس سے زیادہ گمراہ کون جو چلے اپنی خواہش پر بغیر راہ بتلائے اللہ کے۔ نہ صرف گمراہ بلکہ وہ ہلاک بھی ہو جاتا ہے۔''

مزید یہ کہ:

ثُمَّ جَعَلْنٰكَ عَلٰى شَرِيْعَةٍ مِّنَ الْاَمْرِ فَاتَّبِعْهَا وَلَا تَتَّبِعْ اَهْوَآءَ الَّذِيْنَ لَا يَعْلَمُوْنَ ﴿۱۸﴾ (45:18)

''پھر تجھ کو رکھا ہم نے ایک رستہ پر دین کے کام کے۔ سو تو اسی پر چل اور مت چل خواہشوں پر نادانوں کی۔''

قرآن ان کے درجات بلند بتلاتا ہے، جو خدا کی طرف سے علم و برہان کے مطابق چلیں، ان کے مقابل میں جو اپنی خواہشات کا اتباع کریں۔

اَفَمَنْ كَانَ عَلٰى بَيِّنَةٍ مِّنْ رَّبِّهٖ كَمَنْ زُيِّنَ لَهٗ سُوْٓءُ عَمَلِهٖ وَاتَّبَعُوْٓا اَهْوَآءَهُمْ ﴿۱۴﴾ (47:14)

''کیا وہ شخص برابر ہو سکتا ہے، جو خدا کی عطا کردہ بصیرت کی روشنی میں سیدھے راستے کی طرف جا رہا ہو، اس کے مقابلہ میں جو بُرے اور بھلے کی تمیز کھو کر اپنے جذبات (پست) کا اتباع کرے۔''

اس آیت کی رو سے واضح ہوتا ہے کہ اگر انسان عقل اور وحی کی روشنی کے بغیر اپنی جبلی خواہشات کی پیروی کرے تو وہ زمین یعنی پست سطح ہیجانی کیفیت پر آ جاتا ہے۔

انسان حیوانی جبلتوں ہی کے احساس کے تحت مشتعل ہو کر ہیجان کی صورت میں زندگی گزارتا ہے۔ وہ انسانی علم، جو اسے حیوان سے الگ اور ممتاز ارتقاء کا مقام دیتا ہے، ان سے کام ہی نہیں لیتا یا ارسطو کے الفاظ میں عقل بالقوت کو عقل فعال

کی صورت میں لاتا ہی نہیں۔ ہم متعلقہ عنوان میں دیکھ چکے ہیں کہ قرآن انھیں جانور بلکہ جانور سے بھی کم درجہ دیتا ہے۔

قرآن سے بھی ہمیں اس حیوانی زندگی کی کچھ تفصیل ملتی ہے۔ جو اس کے بلا لگام لاشعوری جذبات پر مشتمل ہے۔

ہیجان میں زندگی گزارنے کی روش کا قرآن میں نقشہ:

انسان کی اس حالت کے متعلق مزید تفصیلات کی ہمیں قرآن سے راہنمائی ملتی ہے۔ جن میں چند ایک حوالے کے لیے درج کی جارہی ہیں۔ ان آیات میں خصوصی طور پر ال کے اضافہ کے ساتھ الانسان کے متعلق جہاں یہ کہا گیا ہے کہ انسان ایسا ہے اور ویسا ہے تو اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر انسان وحی کا اتباع نہ کر کے مومنانہ روش نہ اپنائے اور جبلت کے احساسی پہلو سے مشتعل ہو کر ہیجان میں مبتلا حیوانی جذبات کے تابع چلے تو اس کی حالت ایسی ہوتی ہے۔

1۔ خَلَقَ الْاِنْسَانَ مِنْ نُّطْفَةٍ فَاِذَا هُوَ خَصِيْمٌ مُّبِيْنٌ ﴿۴﴾ (16:4)

''انسان کھلا ہوا، جھگڑالو ہے۔''

2۔ وَيَدْعُ الْاِنْسَانُ بِالشَّرِّ دُعَآءَهٗ بِالْخَيْرِ ؕ وَكَانَ الْاِنْسَانُ عَجُوْلًا ﴿۱۱﴾ (17:11)

''انسان بھلائی کی بجائے ان چیزوں کو آواز دے دے کر بلاتا ہے جو اس کے لیے برائی کا موجب ہوں۔ انسان بڑا ہی جلد باز واقع ہوا ہے۔''

3۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ كَفُوْرًا ﴿۶۷﴾ (17:67)

''انسان بڑا ناشکر گزار ہے۔''

4۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ قَتُوْرًا ﴿۱۰۰﴾ (17:100)

''انسان بڑا تنگدل واقع ہوا ہے۔''

5۔ وَخُلِقَ الْاِنْسَانُ ضَعِيْفًا ﴿۲۸﴾ (4:28)

''انسان کو بڑا کمزور پیدا کیا گیا ہے۔''

6۔ اِنَّهٗ كَانَ ظَلُوْمًا جَهُوْلًا ﴿۷۲﴾ (33:72)

''یہ بڑا ظالم اور جاہل ہے۔''

7۔ وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا يَتَمَتَّعُوْنَ وَيَاْكُلُوْنَ كَمَا تَاْكُلُ الْاَنْعَامُ (47:12)

''(وحی کے تابع نہ ہو تو انسانی زندگی محض حیوانی سطح کی رہ جاتی ہے اور مآل جہنم) اور کفر کرنے والے بس دنیا کی چند روزہ زندگی کے مزے لوٹ رہے ہیں۔ اور جانوروں کی طرح کھا پی رہے ہیں۔''

سورہ المعارج میں ترتیب وار اسی الانسان کی چار مزید صفات کا ذکر کیا گیا ہے۔

8۔ وَجَمَعَ فَاَوْعٰى ﴿۱۸﴾ (70:18)

''وہ مال کو تھیلی میں رکھ کر جمع کرتا ہے۔''

9۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ خُلِقَ هَلُوْعًا ﴿۱۹﴾ (70:19)

''پیدائشی طور پر تنگ دل اور بے صبرا ہو جاتا ہے۔''

10۔ اِذَا مَسَّهُ الشَّرُّ جَزُوْعًا ﴿۲۰﴾ (70:20)

''ذرا سی تکلیف پہنچے تو واویلا مچانا شروع کر دیتا ہے۔''

11۔ وَّاِذَا مَسَّهُ الْخَيْرُ مَنُوْعًا ﴿۲۱﴾ (70:21)

''جب مال ہاتھ آ جائے تو کسی ضرورت مند کو نہیں دیتا۔''

سورہ الدھر میں مزید صفات کا ذکر ہے کہ:

12۔ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ يُحِبُّوْنَ الْعَاجِلَةَ وَيَذَرُوْنَ وَرَآءَهُمْ يَوْمًا ثَقِيْلًا ﴿۲۷﴾ (76:27)

''انسان پیش پا افتادہ مفاد کے پیچھے لپکتا ہے۔ (عاقبت اندیشی سے کام نہیں لیتا) اور آگے جو بھاری دن آنے والا ہے اسے نظر انداز کر دیتے ہیں۔''

13۔ اُولٰٓئِكَ هُمْ شَرُّ الْبَرِيَّةِ ﴿۶﴾ (98:6)

''(انسان کو بہترین ہیت کذائی میں پیدا کیا) لیکن یہ لوگ تمام مخلوق سے بدتر ہیں۔''

14۔ اِنَّ الْاِنْسَانَ لِرَبِّهٖ لَكَنُوْدٌ ﴿۶﴾ وَاِنَّهٗ عَلٰى ذٰلِكَ لَشَهِيْدٌ ﴿۷﴾ وَاِنَّهٗ لِحُبِّ الْخَيْرِ لَشَدِيْدٌ ﴿۸﴾ (100:6-8)

''انسان، ربوبیت خداوندی کا ناشکر گزار ہے۔ مال و دولت کی محبت اس پر غالب رہتی ہے۔ وہ سب کچھ اپنے ہی لیے سمیٹ لینا چاہتا ہے۔''

15۔ وَكَانَ الْاِنْسَانُ اَكْثَرَ شَيْءٍ جَدَلًا ﴿۵۴﴾ (18:54)

''بے شک انسان اکثر جھگڑے نکالتا رہتا ہے۔''

16۔ كَلَّآ اِنَّ الْاِنْسَانَ لَيَطْغٰٓى ﴿۶﴾ (96:6)

''یہ انسان بڑا ہی سرکش واقع ہوا ہے۔''

مندرجہ بالا آیات کی روشنی میں نظر آ رہا ہے کہ حیوان اور انسان دونوں میں جبلتیں پائی جاتی ہیں۔ لیکن فرق یہ ہے کہ حیوان، ان جبلتوں پر کوئی کنٹرول نہیں رکھتا جبکہ انسان کو یہ صلاحیت ودیعت کی گئی ہے کہ وہ علم کی صلاحیت کی مدد سے اختیار کے ساتھ ان میں انتخاب کر سکتا ہے۔ یہاں قرآن انسان کی اس حالت کا نقشہ سامنے لا رہا ہے۔ جب انسان حیوانوں کی مانند اپنی جبلتوں سے مشتعل ہو کر ہیجانی زندگی گزارتا ہے، اس کی واضح مثال انسانی زندگی کے بچپن کے دور میں ملتی ہے جب وہ عقل سے کام لینے کے ابھی قابل نہیں ہوتا۔

علم النفسیات کی اصطلاحات، جبلت (خواہش)، عادت اور ہیجان (احساسی پہلو) سے آگاہی کی بحث میں نفسیات کے ماہرین نے انسان کے ارتقاء کا جائزہ انسانی شخصیت کے تصور میں بھی دیا ہے۔ اِس ضمن میں ماہرین نفسیات کا اتفاق ہے کہ شخصیت کسی فرد کے ان منفرد خصائص (Unique characteristics) کی تنظیم ہوتی ہے، جس پر اس فرد کے کردار کا خصوصی اور پیہم انداز، منحصر ہوتا ہے۔ لہٰذا جذبات پر بات کرنے سے پہلے جبلت (خواہش)، عادت اور ہیجان پر مبنی شخصیت کے مفہوم سے آگاہی بھی ہونی چاہیئے۔

جبلت (خواہش)، عادت اور ہیجان پر مبنی شخصیت کے مفہوم کا مُختصر جائزہ:

شخصیت کے متعلق تین باتوں کا ذکر کیا جاتا ہے۔

1۔ اوّل یہ کہ شخصیت منفرد ہوتی ہے۔

2۔ شخصیت بہت سے مختلف خصائص پر جن میں ایک تنظیم پائی جاتی ہے، مشتمل ہوتی ہے۔

3۔ خصائص کی مختلف تنظیم کردار کے خصوصی اور پیہم انداز کو پیدا کرتی ہے۔

مزید یہ کہ کسی فرد کی شخصیت بیان کرتے وقت مسئلہ یہ نہیں ہونا چاہیے کہ اس میں کون سے اوصاف پائے اور نہیں پائے جاتے۔ ایک عمومی معیار کو سامنے رکھ کر یہ فیصلہ ہوسکتا ہے کہ فلاں شخص میں فلاں وصف بہت زیادہ پایا جاتا ہے، فلاں وصف کم پایا جاتا ہے اور فلاں وصف بہت کم پایا جاتا ہے۔

ماہرین نفسیات ابھی تک اوصاف کے تعین کے بارے میں کوئی فیصلہ شدہ فہرست مرتب نہیں کر سکے۔ انسان کا مطالعہ دو طریقوں سے کیا جاتا ہے۔

1۔ ایک طریقہ ماحول سے شروع ہوتا ہے۔ یہ طریقہ انسان کو محض ماحول سے سازگار بننے کا آلہ سمجھتا ہے۔ یہ نظریہ فکر اور ذہن کو مادہ میں تحلیل کر دیتا ہے اور اقتصادی اثرات، غیر شخصی اور غیر ارادی واقعات کے تصور سے تاریخ کی توجیہہ کرتا ہے۔

2۔ دوسرا طریقہ علم النفسیات کی رو سے داخلی کیفیتوں سے ابتدا کرتا ہے۔ یہ طریقہ، انسان کو جبلتوں، عادتوں اور احساسات کا نظام سمجھتا ہے جو انسان کو حوائج، محرکات اور خواہشات کے مربوط نظام میں باندھتا ہے اور ہمیں ماحول کے مطالعہ، استعمال اور تسخیر پر مجبور کرتا ہے۔

حیوانی زندگی کی یہ شخصیت ایک مجبور اور آزادیِ ارادہ سے انتخاب سے عاری ہوتی ہے جبکہ اس کے برعکس جذبات کو انسانی درجہ میں رکھا جاتا ہے، کیونکہ وہاں مکمل اختیار رکھتے ہوئے موزوں جبلت کا انتخاب انسان اپنی فہم سے کر کے اختیار کرتا ہے۔ لہٰذا یہاں جذبات کا مُختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔

جذبات سے مفہوم:

علمِ نفسیات میں میکڈوگل نے جذبات کے متعلق درج ذیل رائے دی ہے جس کو بہت اہمیت دی جاتی ہے۔

''افراد اور معاشروں کی سیرت اور کردار کے سلسلے میں جذبات کی نشوونما بہت اہمیت رکھتی ہے۔ جذبات اساسی اور کرداری زندگی کی تنظیم کا باعث ہوتے ہیں۔ جذبات کے بغیر ہماری ہیجانی زندگی افراتفری کی زندگی ہوگی۔ یعنی تنظیم (Order) توافق (Consistency) اور تسلسل (Continuity) کے بغیر ہوگی اور ہمارے تمام معاشرتی روابط اور کردار ہیجانات اور ان کی انگیختوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے درہم برہم، ناقابل پیشین گوئی اور غیر متوازن ہوں گے۔ جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔ علاوہ بریں خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں۔ اور وہی ہمارے اخلاقی اصولوں کے سرچشمے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ان فیصلوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جن کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہوتا ہے۔

میکڈوگل کے اِس قدرے طویل تصورِ جذبات کے تجزیہ سے درجِ ذیل صلاحیتوں کی نشاندہی ہوتی ہے۔

1۔ افراد اور معاشروں کی سیرت اور کردار کے سلسلے میں جذبات کی نشوونما بہت اہمیت رکھتی ہے۔

2۔ جذبات اساسی اور کرداری زندگی کی تنظیم کا باعث ہوتے ہیں۔

3۔ جذبات کے بغیر ہماری ہیجانی زندگی افراتفری کی زندگی ہوگی۔ یعنی تنظیم (Order) توافق (Consistency) اور تسلسل (Continuity) کے بغیر ہوگی۔

4۔ ہمارے تمام معاشرتی روابط اور کردار ہیجانات اور ان کی انگیختوں پر مبنی ہونے کی وجہ سے درہم برہم، ناقابل پیشین گوئی اور غیر متوازن ہوں گے۔

5۔ جذبات میں ہیجانی میلانات کی باقاعدہ تنظیم ہی کی وجہ سے ہیجانات کی فوری اشتعال انگیزیوں کا ارادی انضباط ممکن ہوتا ہے۔

6۔ خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں۔

7۔ اور وہی ہمارے اخلاقی اصولوں کے سرچشمے ہوتے ہیں کیونکہ ہمارے ان فیصلوں سے تشکیل پذیر ہوتے ہیں جن کا تعلق اخلاقی قدروں سے ہوتا ہے۔

خوبیوں اور قدروں سے متعلق ہمارے فیصلوں کی بنیاد ہمارے جذبات ہی ہوتے ہیں جس طرح انسان میں عقل وشعور، فہم وادراک اور قوت کی مختلف صلاحیتیں ہیں۔ اسی طرح جذبات بھی ایک صلاحیت کے مظہر ہوتے ہیں اور یہ صلاحیت بڑی اہم ہے اس لیے کہ انسانی عمل (کام) کے محرک اس کے جذبات ہی ہوتے ہیں۔ لہٰذا سیرت پختہ اس وقت ہوتی ہے جب فطری (جبلی) اور کسبی (عقلی) میلانات میں تصادم نہ ہو اور جب تمام خواہشات ایک ہی سلسلے میں منسلک ہو جائیں۔ جس طرح عقل وشعور یا دولت وقوت بذاتِ خویش قابلِ نفرت نہیں اسی طرح جذبات بھی بجائے خویش قابلِ نفرت نہیں۔

انسان کی حیوان سے تمیز کرنے کے لیے سپائی نوزا، جذبات کی مزید تقسیم کر کے، انسانی رویہ کی وضاحت کرتا ہے۔

(جاری ہے)

A Speech Delivered By Afia Farooqi
At the Annual Convention 2017

Salam,

I would like to introduce myself by saying that I am the luckiest person to have a father and grandfather(late) who not only listened to the teachings of the honorable Parwez Sahib, but also shared them with me and others.

My name is Afia Farooqi and you will see after hearing what I have to say, that my thoughts are my thoughts because of Parwez Sahib, I am who I am because of Parwez Sahib.

The reason we are all here today is simple, to spread knowledge. As Allah has mentioned in Sura Qadr:

"This one night is better than thousands of months when mankind had been deprived of the light of wahi" – Source: Exposition of Holy Quran, G.A Parwez.

Now Allah is talking about the utmost importance of this one night when human beings were revealed of such "knowledge" which would bring prosperity to mankind and eradicate all the darkness in the world.

We ladies and gentlemen are talking about the one and only book of knowledge 'the Quran'.

It has given us the knowledge to spend our lives in the most ideal manner.

Now everyone holds a copy of Quran in their homes and probably in their pockets too. But what are we doing with this book which has so much knowledge that can change your lives completely.

We are listening to this book, maybe understanding it too. But are we practicing it? Are we implementing it in day to day lives? Is it helping us achieve ideal life, individually or collectively?

Yes! It is. Fortunately or unfortunately it is helping non-Muslims more than it is helping Muslims.

آپ منہ میں روٹی کا ایک لقمہ رکھ کے تین دن گھماتے رہیں وہ آپ کی نشوونما کا باعث نہیں بن سکے گا جب تک کہ وہ آپ کے معدے میں نہ اُتر جائے اور معدے میں اتر کر آپ کے خون کا حصہ نہ بن جائے، اسی طرح علم کی مثال ہے، ہم جتنا بھی علم حاصل کرلیں لیکن اگر اس پر عمل نہیں کریں گے وہ منہ میں رکھے اس نوالے کی طرح ہی ہوگا جو آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتا۔ (مشتاق احمد)

Now, I lived in New York, USA for about two years. Before going there, America was just a villain to me. One way or the other, we always blame America for everything that goes wrong in our country.

But when I go see the villain's face and its beautiful. The standard of living of each individual be it Jew, Hindu, Christian even Muslim is exactly the same. No one has preference over another, be it rich or poor. Why? Because every living individual is a part of the system which is strong and keeps evolving. The system has been developed after shear hardwork and implementing certain set of knowledges. One would say, they don't even pray 5 times a day, they will end up in Jahannum no matter what.

The problem is, we are in constant state of disbelief. While non-Muslims are doing all the hard work and building Jannah in this world, we are just sitting here counting how many prayers we missed and how many hajj we performed.

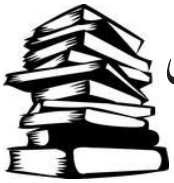
Again, we are reading the Quran, we are understanding it, but when Quran says “Sabr” to stay determined and persistent, and to work hard. We just run towards our praying mats and pray harder. And what do we pray about: “Oh Allah, I hope I get my US Visa. I'll pray 100 Nafl namaz if I get it”.

We are in disbelief. We do not make effort to implement the teachings of Quran. We keep a copy of Quran in our pockets to stay away from the evil eye

of a poor beggar who knocks on your window for a penny.

Because honestly it is easier to roll down your window and give him a penny, also it is easier to pray, it is easier to sacrifice a goat and distribute it among relatives. It is easier to perform hajj, than to go OUT THERE and build a 'System' which provides a source of income for the poor beggar. It is harder to fight corruption, it is harder to provide free education, it is harder to provide free medicine and food it is harder to discover new planets, it is harder to bring Jannah to this world because everyone is waiting for a free Visa to Jannah in the hereafter. We pray so hard, we beg Allah to give us Jannah, but we don't make an effort to build it ourselves. I would urge everyone of you to reach out beyond reading the Quran. Strive to implement it so we can be better than the rest of the nations and prove that we utilized the knowledge that Allah provided in Quran.

کراچی کے احباب کے لیے ضروری اطلاع



اب طلوع اسلام کی تمام بُکس اور ''طلوع اسلام'' میگزین مندرجہ ذیل پتہ پر مل سکتا ہے



محمد اقبال

48 سی، 21 کمرشل اسٹریٹ، میزانین فلور، فیز 2، ایکسٹینشن ڈی ایچ اے، کراچی رابطہ نمبر: 021-35395702, 0300-2275702

آصف جلیل

نالج اینڈ وزڈم سنٹر، سلمان ٹاورز، آفس نمبر A-45، بالمقابل نادرا آفس، ملیر سٹی، کراچی رابطہ نمبر: 021-35421511,0333-2121992

Manzil ba Manzil **(منزل بہ منزل)**

Chapter 6: Tears of passion (*Shola-e-Namnaak* شعلہ نمناک) – To my fellow travelers

(Tulu-e-Islam Convention, April, 1962)

By G. A. Parwez

(Translated by: M. Alam)

Waiting for a caravan to come through the lonely desert;
Well, after a long time, I hear the song of a camel rider!

My dear fellow adventurers: *Salam-o-Rahmat*

Parting for one year is a very long time and patience-enduring. But to reduce my frustration from star-gazing and heart-wrenching I keep you, my dear friends, in my imagination when I am busy in writing – which is, in fact, all the time. Therefore, you are never away from me.

You are always with me!
When no one is with me!

This way I turn the instants of separation into moments of union. And I smilingly tell any enquirer:

Separation spent in memory of my beloved's beauty;
Awaiting morn, the long night passed quite joyfully!

But this joy is really a beautiful make-belief. The pain of this separation only disappears when you, my dear friends, quench the thirst of my vision and heart when you actually arrive here carrying all your sincerity and love. And thus after waiting for a year the season of spring takes over the entire environment; and my dreariness suddenly starts calling:

In the house of sorrow there was no trace of any happiness!
Once you arrived, it started shining with heavenly happiness!

May Allah intensify the speed of your inner driving force because this is the heavenly journey of the passionate caravan heading towards Quranic destination!

Don't ask how focused this shining caravan is in its Quranic journey?
Its wherewithal is but the strength of its character, and a firm belief!
How dignified its life is, and how lovely is the sound of its divine bell?
As a wave in the ocean it moves gracefully with its own power sans wind!

Success of our movement

My dear friends, I surrender before Allah at every step for the success that this movement is having by His Grace although its resources are next to nothing. Just think about it my friends! In terms of numbers it has only a small band of dedicated souls. Its resources are extremely meagre. There is no

outside endorsement from any quarter. There is no help or support of any kind from anywhere. These unfavorable conditions? – But such a level of success that there is no corner of the country that has not been introduced to the voice of Tulu-e-Islam! There is much talk surrounding the Quranic message among the intelligentsia of the country. The educated youth is getting introduced to this message. This message has reached the intellectuals in the West as well. And research scholars from the West come to see me to gain more information about our movement. Recently a German explorer visited me; and he has devoted one chapter about Tulu-e-Islam movement in his book about India and Pakistan. What could be the reason for this miraculous success other than the fact that there is intrinsic power in the voice of truth which compensates for the lack of resources to a large extent? The cosmic forces of Nature are ready to lend their support to the group that rises up to propagate the voice of truth. And the world sees with its own eyes this scene that:

Sun's ray is itself intensely driven by its surreal desire;
Else the reality of dew's flight is all very well-known!

I am getting convinced and my hope is turning into reality that:

My constant wailing will melt hearts in favor of this message;
Every sincere soul of this Ummah is eager for this message!

The benefit of opposition

Sometimes the Nature's program is strange in favor of the voice of truth. It compensates the lack of means of the followers of truth by the powerful means of the proponents of falsehood. This is exactly what has happened in regards to propagating our message of the Quran. How could we have propagated this message so far and wide in such a short time with such meagre resources at our disposal if it wasn't for our enemies' powerful opposition? It was beyond our wildest imagination to believe how the propaganda of our enemies could propel our mission so fast?

Who could believe the working of the storm of falsehood?
That it will propel my boat to the bank of the shore so soon!

It is mentioned in the story of Ibrahim (PBUH) that all animals tried to extinguish the fire that Nimrod lighted for him except the Chameleon, who tried to enflame it as much as he could by blowing air on the fire on top of its lungs. But the result was that the fire turned into Abrahamic safe heaven. May Allah make its lungs even stronger!

Thanks to the truth's enemies and their hoopla;
Truth's sway and its power reached high level!

Reason for opposition

My dear friends, have you ever thought about why there is so much opposition against Tulu-e-Islam? All religious sects are constantly involved in

sectarian fights among themselves because every sect wants to keep its monopoly. Tulu-e-Islam is not any religious sect. Its entire teaching is against sectarianism. It calls for the unity of Ummah and the brotherhood of Muslims – in fact it is the herald for the brotherhood of universal of humanity. Those who agree with its message do not enter into any new sect nor do they form any kind of a separate religious group compared to other Muslims. They practice the religious rituals like prayer, fast etc. the way they were doing before. (I myself belong to Hanafi family and pray according to Hanafi way.) They do not believe in the coming of any new prophet after the last Prophet Muhammad (PBUH), whether it is called sainthood, prophet-hood, or any other-hood. Tulu-e-Islam believes that after the last Prophet (PBUH), Islam cannot be attached with any person except only with the Islamic system. It believes the authority in Islam cannot be any person's saying or action. It is clear that if this is the ideology of Tulu-e-Islam then there is no question of it forming a sect. Therefore, the opposition to it cannot be done on the basis of religious sectarianism.

Moving on from religious sects to political parties, we find that these parties also fight with each for their own self-interests. Tulu-e-Islam does not have any connection with any political party either. It believes that just as sectarianism is destructive to دین (*Deen*), creating political parties is also destructive to دین (*Deen*) and Ummah. The Muslim Ummah is itself a party compared to non-Muslims, so there is no question of having any parties – whether political, social, or religious –within it. Therefore, the opposition to Tulu-e-Islam is not based on political rivalry.

From this it is clear that their opposition to Tulu-e-Islam is not due to fear that one day it will become a powerful sect or party. Their opposition is in fact the opposition to the voice of the Quran that it raises. In the words of the Quran: قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِيْ يَقُوْلُوْنَ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ۝ (6:33) – We are well aware that what they say grieves you. But you should know that it is not you whom they charge with falsehood; it is Allah's laws which they treat as false.

Think about it my friends that hundreds of thousands of books and literature is published in the country that are not only against the foundation of دین (*Deen*) and Islam but these publications corrupt and destroy the moral and ethical fabric of the society and its citizens. These people who are so much against Tulu-e-Islam never bother to create a united front against such corrupt literature and demand its confiscation or censure.

Also, there are many people in the country who not only deny Allah, His revelation, His Prophet (PBUH), and Hereafter but (May Allah protect) make fun of them. There are people who feel proud to call themselves atheists. These custodians of religion never pronounce fatwas against them; nor declare that

their wives divorced; nor object to offering their funeral prayers; nor object to burying them in Muslim cemeteries. But these custodians of religion become furious against those who truly want to carry out their Iman in Allah, His Prophets, His Books, His *Malaaika*, and the Hereafter precisely the way the Quran tells; those who try to spread the light of Allah in the world; and those whose goal is that same Islamic system become truly get established among Muslims that the Prophet (PBUH) and his companions established fifteen hundred years ago in Hijaz; and in whose implementation the humankind's evolution and future destiny lies. These so-called custodians of religion form a united front and work day and night to foment storm of opposition against these true servants of Allah. And they pronounce fatwas against them that

These people are unbelievers and outside the orbit of Islam. No Muslim women can be married to them. The sacred bond of marriage is null and void of a Muslim woman who is married to them. No funeral prayer will be held for them. They cannot be buried in a Muslim cemetery. [Published fatwa by one thousand "Islamic scholars" against me]

The revolutionary voice of the Quran

These high custodians of religion went so far as to pronounce fatwa that these people should be killed. What is their crime? Well, their crime is: إِنَّ الَّذِيْنَ قَالُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ (46:13) – They say Our Sustainer and Master is only Allah; وَنَحْنُ لَهٗ مُسْلِمُوْنَ (2:136) – That we surrender unto His laws and orders. That we don't surrender to anyone else's laws and orders.

Just as I said a moment ago, their opposition is not to us but to the voice of the Quran that we try to advance. And the reason is obvious: the Quran does not let any human being or a group of human beings rule over or pass order to other human beings. It does not allow anyone to live a comfortable life on the backs and hard work of others. The Quran removes all intermediaries and powers – whether temporal or religious – between human being and Allah.

What is the Quran? It is a message of death for all rulers;
It is a protector of the weak and helpless and sufferers!

In other words, it is the message of death of all types of slavery. Therefore, how could proponents and forces of status quo – that control human beings' life here on Earth as well as their future life – tolerate such a revolutionary voice of the Quran that does not even recognize their existence, let alone allow them to have rampart over people? Therefore, their opposition to the voice of the Quran is quite understandable.

Under the grip of Mullah's sour face we don't look at our own mind's way;
If I am Muslim then I must face towards the Kaaba as this is the right way!

Their opposition reached such a level that if someone even subconsciously

mentions that for certain matter we have to seek solution from the Quran then these custodians of religion become so infuriated that they charge him that he has become "Parwezi." And the person feels completely stunned at this because he does not know what they are talking about. He starts thinking as to what he has done wrong that these people are so angry about? That is, they cannot even tolerate to hear the name of the Quran to solve our problems. How deep a psychological condition is this that the Quran has mentioned of these people when it says:وَلَقَدْ صَرَّفْنَا فِيْ هٰذَا الْقُرْاٰنِ لِيَذَّكَّرُوْا ۭ وَمَا يَزِيْدُهُمْ اِلَّا نُفُوْرًا (17:41) – Just reflect in how many different ways We have explained in this Quran what is good for them. Yet their aversion to it is ever-increasing. May Allah have mercy on our condition!

Their mental level

My dear friends, among these people there is a section that knowingly opposes the teachings of the Quran because it harms their selfish interests. The other section is of those people whose mental level is such that they cannot comprehend the Quranic reality. So, to them only that Muslim is right who thinks like them; who says what they want to hear. Anyone whose mental level is higher and who independently ponders in the Quran – to them he is unbeliever. This is what they have turned the Quran into – to recite Surah Yasin so that death can be hastened! Allama Iqbal said about them in Javid Nameh:

Mullah's heart is unaware of Allah's revelation; His Book is fiction to him
He is devoid of Prophet's wisdom; His sky is totally dark without any stars
He is narrow-minded, short-sighted; licentious; only involved in vain talks
The school of Mullah and the meaning of the Book?
Totally devoid of any wisdom and light of the Book!

Touchstone for Islam according to these people

These people charge Iqbal: what did he know about Islam, he didn't have beard? I didn't say this as a joke or hearsay, my friends. This is the first objective test of Islam to these people! I had written to Mufti Muhammad Shafi in reply to his letter:

I just want say to that the literature on whose basis I am declared کافر (*Kafir* or unbeliever) has attracted thousands of educated youth to Islam, who otherwise, would have been overtaken by materialism of the West or gone into the lap of communism.

At this, a newspaper that is representative of his group wrote:

Can Mr. Parwez tell who are these youth and where do they live? Can he point out even one among these thousands of youth, who was beardless and materialist before and after reading his literature became believer in God and grew a beard? [Asia, 26 March, 1962]

My dear friends, if this is the situation with these custodians of religion then how can Iqbal's saying will have any weight in their sight? Let me present couple of examples of learned scholars from among them, and you can see for yourself what they think of these people? Mufti 'Abduh was an internationally recognized Islamic scholar from Egypt. He writes about Al-Azhar, the most famous Islamic university in the Muslim world:

Whoever spends more time in acquiring knowledge in Al-Azhar or similar universities, his ability to acquire knowledge disappears. [Tafsir Al-Manaar, Vol. 1, page 181].

His student Syed Rashid Rida writes about him:

His view was that there is no hope of any reform for scholars and sheikhs of Al-Azhar and of similar universities.

My dear friends, if this is the state of the best Islamic university in the world then you can very well imagine the condition of our own Darul 'Uloom (العلوم دار). Maulana Abul Kalam Azad was called the Imam-al-Hind and has painted the picture of the knowledge taught by our Islamic scholars thus:

After a long time of pondering this reality opened up to me that there are only two reasons for the Ummah's wretched condition which can be termed "Greek-ism" and "Iranianism." The root of Ummah's evil started from these sources. If a wise person with deep knowledge were to analyze the material that is taught in our religious schools then he will be shocked to find how much these two sources have corrupted our Madrasah's curriculum. Even the Islamic metaphysics and the Sharia have been affected by them, what to say of history and narrations.

Moving from the past personalities, the current ones are not far behind them. Syed Abul Ala Maududi writes about our Ulema:

The schools of study and training from which these Ulema come from and the environment in which they live – there is no place in them for essential foundation of دین (*Deen*) and reformation of the Ummah. All their interests reduce to debating trivial matters. These people never try to understand the temperament of the current generation or the demands of time. Although these Ulema show their extreme revulsion for things that are alienating the current generation from Islam, they don't do anything concrete to alleviate this situation. These people do not have any idea how to understand the complex problems of modern times, let alone solving them. Few have attempted but have failed miserably. This is because these problems cannot be solved without Ijtihad, but these Ulema have forbidden Ijtihad on themselves. And the methodology that they are adopting for teaching Islam and Islamic laws, these, instead of attracting people to the cause of Islam, create disgust among them for Islam. After reading their writings or listening to their lectures a voice

tells the heart that, God forbid, what kind of impression it will leave on non-Muslims if they were to read their writing or listen to them.[*Tafhimat*, page 28].

You may probably know that the program through which these people go through to get their religious education and are awarded the degree of "Aalim" does not include the Quran in its curriculum. In the final year the tafsir of Baidawi of only Surah Baqra is taught as a grace. So, if these people oppose the Quran then it is understandable. They are helpless. They are simply incapable of understanding the Quran.

How could disillusioned comprehend what I say?
Their world is different and my world is different!

As Allama Iqbal has said:

If your mind is wretched and your hands are feeble;
Is it your fault or of palm tree that its fruits are high?

Opposition based on ignorance

Well, whatever is beyond their mental grasp these people think that it is forbidden or unbelief? And therefore they consider opposition to it as a big Jihad? If somehow their mental level could be raised so that they are able to understand the deep concepts and realities of the teachings of the Quran, then don't ask how their life will be transformed?

Who knows what he would say; what he would do; what he would see?
If God could give the "Pious one" too the same eyes as He has given me!

When one starts to *understand* the Quran then one doesn't get entangled in trivial matters or useless religious debates. His mental vision and his thoughts become cosmic. He focuses on the principles and the foundation of دین (*Deen*) and important issues of life facing humanity. He tries to get closer to anyone who has even slightest interest in learning the دین (*Deen*). If these Ulema were fortunate to drink even a cup of knowledge from the ocean of the Quran, then their world will change and they will find themselves closer to you. Those who have their eyes on the Quran become the dearest friends and members of one family. That is why I keep saying to these Ulema:

They are separate but you will start trusting me;
If only you could, with your heart, listen to me!

But the difficulty is that the education they get in the Madrasas doesn't let them come near the Quran. And since they are told that everything that is against what they have been taught is false, these people oppose the Quran and those who present its message.

(To Be Continued).....

(ب) انسانی ذات میں یہ صفات بطور ممکناتِ زندگی مضمر یا خوابیدہ شکل میں ہوتی ہیں۔ان کو مشہود یا بارآور (Actualise) کرنا ہوتا ہے۔

(ج) صفات خداوندی کے جذبات سے بلند، منزا اور مبرا ہونے کے بالمقابل، انسانی صفات میں جذبات کا دخل ہوتا ہے۔شہودِ صفات سے پہلے جذبات پر پورا پورا کنٹرول کرنا لازمی امر ہوتا ہے۔

5- انسانی زندگی کا مقصود یہی ہے کہ ان صفاتِ خداوندی کو معیار بناتے ہوئے ہر ممکن استعداد سے انہیں اپنے اندر منعکس کیا جائے۔جوں جوں انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ہوتی جاتی ہے وہ خدا کا قرب حاصل کرتا ہوا اس کے رنگ (صبغۃ اللہ) میں رنگا جاتا ہے۔اس طرح وہ خدا کے تخلیقی پروگرام میں شریک ہوتا جاتا ہے اور خدا اور بندے کا تعلق رفاقت کا ہو جاتا ہے جس میں بہرحال خدا رفیق اعلیٰ ہوتا ہے۔

6- صفاتِ خداوندی کی انسانی ذات میں نمود سے جوں جوں اس کی نشوونما ہوتی جاتی ہے، یہ اس کے ایمان اور سیرت میں مزید پختگی کا باعث بنتی ہے۔اس طرح وہ ارتقائی مراحل سے گذرتے ہوئے حیات بعد الممات کا امیدوار بننے کے قابل ہو جاتا ہے تاکہ اس مقام کے حصول کے بعد وہ مزید ارتقائی مراحل طے کرنے کی صلاحیت حاصل کر سکے۔

7- صفاتِ خداوندی متعدد اور متنوع ہونے کے علاوہ بعض مقامات پر، باہم گر متضاد بھی ہیں۔مثلاً وہ رحیم و کریم بھی ہے اور جبار و قہار بھی۔ذات (کیریکٹر) کے معنی یہ ہیں کہ جس جگہ جس قسم کی صفت کی نمود ضروری ہو وہاں اس صفت کا ظہور ہو اور حسنیٰ کے تحت اس قدر ظہور ہو جس قدر اس موقع پر اس کی ضرورت ہو۔اگر غفور و رحیم کی صفات کے اطلاق ہونے کے مواقع پر قہاریت و جباریت کی صفات کا ظہور ہو جائے تو اس سے نظامِ عالم میں اصلاح کی بجائے فساد برپا ہو سکتا ہے۔

8- انسانی ذات میں ان صفات کی نمود ایسی شے نہیں جس کے متعلق دوسرے کو کچھ علم ہی نہ ہو سکے۔ان صفات کا اظہار، انسان کی سیرت و کردار میں ہوتا ہے، جو مرئی اور محسوس شکل میں ہر ایک کے سامنے آ جاتا ہے۔اسی کو انسان کا کیریکٹر کہتے ہیں۔

☆☆☆

(اشاعت کے لئے محترم ڈاکٹر انعام الحق نے تعاون کیا ہے۔)

☆☆☆☆☆☆☆☆☆☆

PUBLISHED SINCE 1938 AT THE BEHEST OF ALLAMA IQBAL[R] AND QUAID-E-AZAM[R]

CPL.NO. 28
VOL. 71
ISSUE
1

Monthly
TOLU-E-ISLAM

25-B, Gulberg 2, Lahore, Pakistan
Phone. 042-35714546, 042-35753666
E-mail:idarati@gmail.com
Web:www.toluislam.com www.facebook.com/talueislam/

لَوح بھی تو قلم بھی تو تیرا وجود الکتاب!
گنبدِ آبگینہ رنگ تیرے محیط میں حباب!
عالمِ آب و خاک میں تیرے ظہور سے فروغ
ذرّۂ ریگ کو دیا تو نے طلوعِ آفتاب!
شوکتِ سنجر و سلیم تیرے جلال کی نمود
فقرِ جنید و بایزید تیرا جمالِ بے نقاب!
شوق ترا اگر نہ ہو میری نماز کا امام
میرا قیام بھی حجاب! میرا سجود بھی حجاب!
تیری نگاہِ ناز سے دونوں مراد پا گئے
عقل غیاب و جستجو! عشق حضور و اضطراب

(علامہ اقبالؒ)